راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 18واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

ماہنامہ
ارژنگ
لاہور

مدیر اعلیٰ: عامر بن علی

مدیر: حسن عباسی

ستمبر 2016ء

معروف شاعر اور صحافی طاہر نسیم سے عامر بن علی کی گفتگو

میڈیائی یلغار نے ادب کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا، بھانڈازم کو ادب کا لبادہ پہنایا جارہا ہے۔

اردو ہماری قومی اور واحد رابطے کی زبان ہے اگر اس پنائیں گے تو ملک ترقی کرے گا۔

ارژنگ ۔۔ آپ شاعر ہیں اور صحافی ہیں عہد حاضر کے ادب اور ادبی صورتحال پر کچھ روشنی ڈالیں گے؟

طاہر نسیم ۔۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے ایک محسوس کرنے اور جاننے والا تخلیق کار بنایا عہد حاضر میں ادب اور ادبی صورتحال اتنی اچھی نہیں مگر مایوسی بھی نہیں میرے خیال میں ادب کو تعمیر ذات کے ساتھ ساتھ تعمیر ملت کا سبب بھی ہونا چاہیے جب تعمیر ملت کا خیال کریں گے تو ادبی صورتحال بھی بہتر ہوگی۔

ارژنگ ۔۔ بڑھتا ہوا میڈیائی یلغار ادب کے لئے معاون ثابت ہوا؟

طاہر نسیم ۔ بڑھتے ہوئے میڈیائی یلغار نے ادب کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا بہت کم ایسا ہوا ہے کہ چینلز پر کوئی معیاری مشاعرہ یا ادبی ٹاک آئی ہو ورنہ تو بھانڈازم کو ادب کا لبادہ پہنایا جارہا ہے۔

ارژنگ ۔۔ نئی نسل میں ادبی رجحانات پیدا کرنے کے لئے کن کن اقدامات کی ضرورت ہے؟

طاہر نسیم ۔ بہت اہم سوال ہے ۔ ادب اور ادبی رجحانات جس تیزی سے نئی نسل میں ناپید ہورہا ہے مجھے کبھی کبھی بہت پریشانی ہوتی ہے میں نے کالجوں اور یونیورسٹیوں کی لائبریریوں کا جائزہ لیا ہے وہ ویران ہورہی ہیں سرکاری اور غیر سرکاری لائبریریوں کا بھی یہی عالم ہے لائبریری ادب کے فروغ کا بنیادی ذریعہ ہے ہمیں ان میں یہ شوق پیدا کرنا ہوگا اساتذہ کو اس سلسلے میں ذمہ دارانہ کردار ادا کرنا ہوگا۔

ارژنگ ۔۔ ادبی گروہ بندیوں کے حوالے سے کچھ کہنا چاہیں گے؟

طاہر نسیم ۔ اختلاف انسانی سرشت کا حصہ ہے مگر یہ بہتری اور تعمیر کے لئے اچھا لگتا ہے مگر جب آ ادب سے ہٹ کر ذاتی اختلاف کرنے لگتے ہیں تو خرابی شروع ہوتی ہے میں سمجھتا ہوں کہ تخلیق ادب کی معراج اور منشاء انسانیت ہے اور اسی کو ہونا چاہیے عہد گزشتہ میں نامور ادبی شخصیات کی گروہ بندیوں اور اختلافات کا مجموعی طور پر ادب اور ادب سے وابستہ لوگوں کو نقصان ہی ہوا ہے۔

ارژنگ ۔۔ ادب اور ادیب کی بہتری میں حکومتی اقدامات سے مطمئن ہیں؟

طاہر نسیم ۔ حکومتی سطح پر بہت سے اقدامات کی ضرورت ہے جس طرح موجودہ حکومت اور خاص طور پر وزیر اعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف تعلیمی شعبے کی ترقی کے لئے خصوصی توجہ کئے ہوئے ہیں اسی طرح ادب کے شعبے پر بھی توجہ دیں تو بہتری ہوسکتی ہے صوبائی، ڈویژنل، ضلعی اور تحصیل کی سطح پر لٹریری کی نسلیں تشکیل ہوں وہ مشاعروں، مذاکروں، مباحثوں کا اہتمام کریں تخلیق کاروں کی فلاح کے لئے منصوبہ بندی کریں اور مجھے یقین ہے کہ عطاء الحق قاسمی صاحب کا رول اس سلسلے میں مشعل راہ ہے۔

بقیہ اندرونی صفحات

معروف شاعرہ

لبنیٰ صفدر

کے مقبول عام شعری مجموعوں کے بعد تازہ شعری مجموعہ

تم محبت کا استعارہ ہو

نہایت منفرد اور دیدہ زیب انداز میں اشاعت کے آخری مراحل میں

نستعلیق
Publications
غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 0331-4489310
nastalique786@gmail.com

نامور شاعرہ، سفرنامہ نگار اور افسانہ نویس

نیلما ناہید درانی

کا ادبی سفر

پاکستان میں سب سے زیادہ شاعری کی کتب شائع کرنے والا ادارہ

نستعلیق

Publications

ہم کتاب کو اہتمام سے شائع کرتے ہیں

کیونکہ ہمیں کتاب سے محبت ہے

مسودہ کی تیاری، کمپوزنگ، ایڈیٹنگ، پروف ریڈنگ

ٹائٹل ڈیزائننگ، پیسٹنگ، طباعت، جلد بندی

تمام مراحل مکمل ذمہ داری اور پیشہ ورانہ تجربے کے ساتھ

خوبصورت کتاب کی اشاعت ایک آرٹ ہے

اپنی کتاب کی دیدہ زیب اشاعت کے لیے آج ہی رابطہ کیجیے

نستعلیق

Publications

غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور

0300-4489310 - 0331-4489310

nastalique786@gmail.com

آصف شفیع کا نیا شعری مجموعہ

”جدا ہونا ہی پڑتا ہے“

مکمل اہتمام کے ساتھ شائع ہو گیا ہے

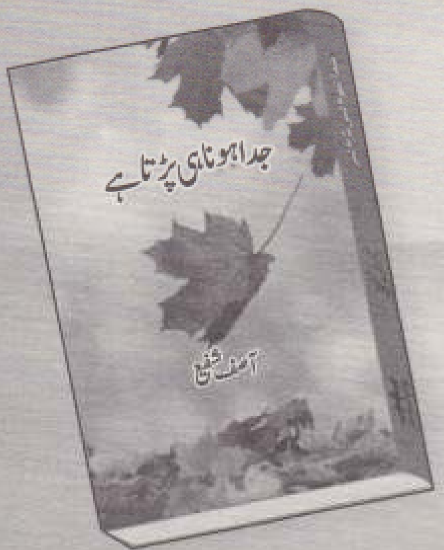

سعد پبلیکیشنز

سیکنڈ فلور میاں مارکیٹ اردو بازار لاہور

0333-8831110

saadullahshah2009@hotmail.com

پرندے اڑ گئے پیڑوں سے لیکن
صدا نغموں کی اب تک آ رہی ہے
حسیں یادوں کی سرکش موج آصف
کنارِ خواب سے ٹکرا رہی ہے

نامور شاعر احمد سبحانی آکاش کے شعری مجموعے

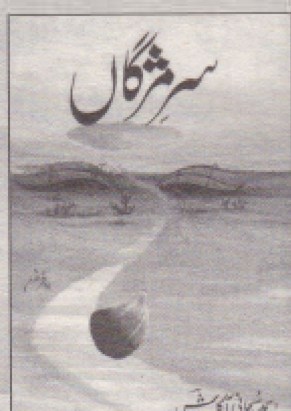

1998

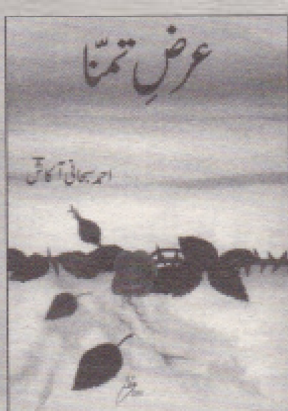

2000

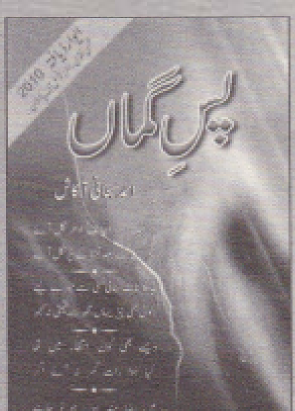

2010

آئینہ جس جگہ سے آیا ہے
عکس بھی چاہیئے وہیں کا مجھے

ملنے کا پتہ: ”ماورا“ شاہراہ قائد اعظم لاہور

حُسن اور حکومت سے کون جیت سکتا ہے
یہ بتاؤ دونوں کی عمر کتنی ہوتی ہے

شاعر، کالم نویس، مترجم اور ماہنامہ ''ارژنگ'' کے مدیرِ اعلیٰ

عامر بن علی

کی کتب کے نئے ایڈیشن مکمل اہتمام کے ساتھ شائع ہو گئے ہیں

- چلو اقرار کرتے ہیں (شعری مجموعہ)
- سرگوشیاں (شعری مجموعہ)
- ''محبت چھو گئی دل کو'' (شعری مجموعہ)
- گفتگو (انٹرویوز)
- آج کا جاپان (کالم)
- محبت کے دو رنگ (تراجم)

ناشر: حسن عباسی

نستعلیق Publications

غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 042-3751963
nastalique786@gmail.com

اُس اجنبی سے ہاتھ ملانے کے واسطے
محفل میں سب سے ہاتھ ملانا پڑا مجھے

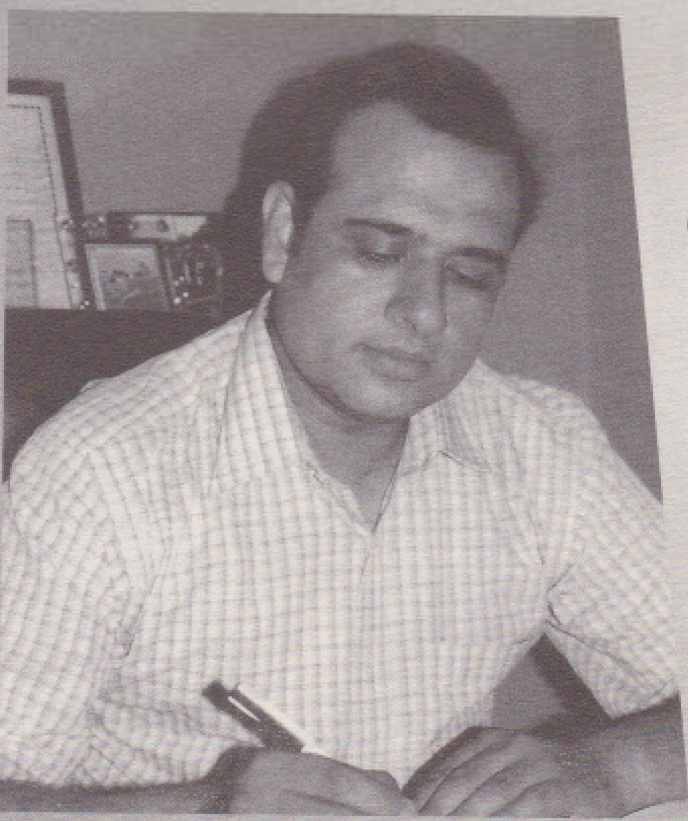

شاعر اور سفرنامہ نگار حسن عباسی کی کتب

شعری مجموعے

- جگنو میری سوچوں کے
- ہم نے بھی محبت کی ہے
- ایک محبت کافی ہے
- اک شام تمہارے جیسی ہو
- سائیں (حمدیہ مجموعہ)

سفرنامے

- محبت کے پروں میں گھنٹیاں باندھو (بھارت)
- ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا (یو-اے-ای، دوحہ)
- تتلیاں ستاتی ہیں (یورپ)

اپنی کتاب کی بہترین اشاعت کے لیے رابطہ کریں

ناشر: حسن عباسی

نستعلیق Publications

غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 042-3751963
nastalique786@gmail.com

راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیراہتمام مسلسل اشاعت کا 17 واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

ماہنامہ
ارژنگ
لاہور

جلد نمبر 18 • ستمبر 2016ء • شمارہ نمبر 9

مدیر اعلیٰ ۞ عامر بن علی

مدیر ۞ حسن عباسی

{مجلس ادارت}

ڈاکٹر صغرا صدف ۞ ابرار ندیم ۞ ڈاکٹر جعفر حسن مبارک

قمر ریاض (مسقط) ۞ سید اسد رضوی ۞ سعدیہ سیٹھی (برطانیہ)

{مجلس مشاورت}

محمود ظفر اقبال ہاشمی (سعودی عرب) ۞ ظفر خان (آسٹریلیا) ۞ ارشد نذیر ساحل (سپین)

محمد ادریس لاہوری (ناروے) ۞ ناز اوکاڑوی ۞ لبنیٰ صفدر

کمپوزنگ ۞ زرناب کمپوزنگ : 0321-4730769 نوڈرافر ۞ نعمان حسن: 0333-4918383

آرٹ اینڈ گرافکس ۞ محمد احسن گل : 0300-4529821

پتہ برائے خط کتابت

ماہنامہ ارژنگ

F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

حسن عباسی: 0300-4489310 ناز اوکاڑوی : 0301-4492133

nastalique786@gmail.com

قیمت فی شمارہ 100 زرسالانہ بذریعہ ایزی پیسہ بھیجنے کے لیے

Hassan Mahmood - ID.No 31204-7298386-9 - Cell: 0300-4489310

سالانہ ممبرشپ

ڈاک خرچ (پاکستان) 1000 روپے • ڈاک خرچ بیرون ملک 5000 روپے

رابطہ : 0331-4489310 - 0300-4489310

فہرست

حمد، نعت، سلام ' ۲

گوشہ نعت: پروفیسر طاہر صدیقی، عمران مفتی ' ۴

مضامین:

- تنقید کیا ہے؟ / پروفیسر آل احمد سرور ' ۶
- ایک عہد کی موت / احمد جلیل ' ۱۴
- سید منظور الکونین - آخری کلاسیک نعت خواں / ارسلان احمد ارسل ' ۱۶
- اکرم ناصر...... توانا لہجے کا شاعر / پروفیسر میاں محمد مرغوب ' ۱۸
- ترو بنی تیرے نام - ایک تخلیقی شاہکار / خورشید بیگ میلسوی ' ۲۰
- تمہارا رہنا سیکھ لیا ہے...... ایک جائزہ / سرور ارمان ' ۲۲
- کچھ نیلما ناہید درانی اور اس کی شاعری کے بارے میں / سکندر منصوری ۲۳
- لبنیٰ صفدر ایک باشعور شاعرہ / دستگیر شہزاد ' ۲۵
- لفظ کو حرمت معانی دی / صائمہ نورین بخاری ' ۲۷
- رضوانہ سید علی / سعدیہ بتول ' ۲۹
- فلمی اور علمی شخصیت آصف جاہ / فراست بخاری ' ۳۰
- ہائر ایجوکیشن (طنز و مزاح) / احمد سعید پرنگال ۳۲

شعری گوشے: عنبرین صلاح الدین، انیس احمد، مبشر سعید، عرفان اللہ عرفان، علی جوشا، خالد مسعود ۳۵ تا ۴۰

افسانے: x بیٹی جیسی گڑیا / ترجمہ: ستار طاہر ' ۴۱

x فن تشہیر / ترجمہ: ستار طاہر ' ۴۳

x تہی داماں / صبا ممتاز بانو ' ۴۵

x بابل تیرے آنگن کا چاند / طیبہ امیر ' ۴۷

x ذرا نم ہو تو یہ مٹی / نادیہ احمد بشیر ' ۵۵

x بارش اور آنسو / آمنہ نثار ' ۵۷

شاعری (غزل) ' ۵۸ تا ۵۹

x بقیہ انٹرویو / طاہر نسیم ' علی رضا ' ۵۹-۶۳

مختصر ادبی خبریں ' ۶۴

تبصرۂ کتب ' ۶۶

نامہ ہائے احباب ' ۷۱

Far East Marketing Co.

Samaria Mansion 605 Koenji-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 166-0003 Japan
E-mail: femc1@hotmail.com

بحر و بر کا نور ہے شمس و قمر کا نور ہے
اور کوہِ طور کے روشن شجر کا نور ہے
چشمِ حیرت دیکھتی ہے چار سو اس نور کو
ایک اک انسان کے جان و جگر کا نور ہے
جنگ کے میدان میں ہر اک مجاہد کے لیے
حوصلے کا نور ہے تیغ و سپر کا نور ہے
ضوفشاں منزل رہے شام و سحر جس کے سبب
زائرِ بیتِ حرم کے وہ سفر کا نور ہے
جو ہے قلب و نظر کی اک متاعِ بے بہا
بحر کی تہہ میں صدف کے وہ گہر کا نور ہے
لفظ و معنی کے چمن میں جس سے آتی ہے بہار
شاعرِ الحمد کے تیرے ہنر کا نور ہے
جگمگائیں جس سے قرآنِ جبیں کی آیتیں
وہ تو گوہرؔ کے حسیں فکر و نظر کا نور ہے

گوہرملسیانی/لاہور

تو حسین ہے تو جمیل ہے
تری خلق اس کی دلیل ہے
تو کریم قادر و مہرباں
تو خدائے ربِ جلیل ہے
میں یہ چاہوں بس مجھے تو ملے
یہ جہاں متاعِ قلیل ہے
تجھے رد کرے کوئی کس طرح
ذرہ ذرہ تیرا وکیل ہے
میں جو مشکلوں سے گزر گیا
ترا ذکر میری سبیل ہے

نیازت علی نیاز/لاہور

روشنی ہو عطا اے خدا اے خدا
در ترے پر کھڑا اے خدا اے خدا
در ترے سے ملا جس قدر بھی ملا
جس کسی کو ملا اے خدا اے خدا
ہو خطاکار یا کوئی ہو پارسا
تو ہے سب کا خدا اے خدا اے خدا
جب بھی مشکل بنی نام تیرا لیا
ٹل گئی ہر بلا اے خدا اے خدا
بدنظر کی نظر میں ہیں آئے ہوئے
بدنظر سے بچا اے خدا اے خدا
بات بگڑی ہے امجدؔ کی سب دیکھتے
اس کی بگڑی بنا اے خدا اے خدا

امجد شریف/گوجرانوالہ

ثنا خواجہ کی حسنِ ذوقِ صبح و شام دیتی ہے
مرے اسلوب کو الفاظ بھی گل فام دیتی ہے
رسولِ ہاشمیؐ کے سیرت و کردار اپنا لو
ہوائے گلشنِ طیبہ یہی پیغام دیتی ہے
عمل کر کے دکھایا سرورِ کونینؐ نے ان پر
خدا کی جو کتابِ ضو احکام دیتی ہے
قیامت تک نبوت ہادیِ عالمؐ کی تاباں ہے
جہاں کے ہر بشر کو دعوتِ اسلام دیتی ہے
گلستانِ مدینہ میں صبا ہر وقت رندوں کو
شرابِ دین و ایماں کے چھلکتے جام دیتی ہے
جو اپنائے امام المرسلیںؐ کی سیرتِ اقدس
وہی ملت جہاں میں فرضِ دیں انجام دیتی ہے
کے ہادی بنائیں جادۂ پرخار میں گوہرؔ
کتابِ نورِ محبوبؐ خدا کا نام دیتی ہے

گوہرملسیانی/لاہور

مدینے کی جس کو گدائی ملی ہے
اُسے رب کی ساری خدائی ملی ہے
محبت کے سارے خزانے ہیں اُس کے
اُسے غم کدے سے رہائی ملی ہے
سمیٹے وہ راحت درِ مصطفیٰؐ سے
جسے مجتبیٰؐ تک رسائی ملی ہے
وہاں سبز گنبد کے نورانی جلوے
تخیل کو کیا پارسائی ملی ہے
بھلا کر بھلا کر نواسوں کے صدقے
تجھے بھی خدا سے بھلائی ملی ہے
مجیدؔ اب زباں پہ رہے نعت اُن کی
مجھے مصطفیٰؐ سے اچھائی ملی ہے

عبدالمجید چھٹہ/لاہور

مصیبت میں جو بھی پکارے محمدؐ
ہیں اس کے سہارے ہمارے محمدؐ
تیری محفلیں ہم سجایا کریں گے
کرم ہو خدا کے دُلارے محمدؐ
عطا وہ بھی کر دیں کبھی جو نہ مانگوں
کریم جہاں ہیں ہمارے محمدؐ
رکھو لاج دونوں جہانوں کے والی
پکاریں مصیبت کے مارے محمدؐ
منور ہوا تیرا دیں کربلا میں
بجھے جونہی تیرے ستارے محمدؐ
بس اپنی نظر سے پلا آج ساقی
ہیں رند آئے سارے کے سارے محمدؐ
بھنور میں ہے کشتی میری زندگی کی
لگا دو مجھے اب کنارے محمدؐ
تیرا ذکر کرتا ہے دن رات عابدؔ
دکھا دے مجھے اب نظارے محمدؐ

رائے عابد علی/لاہور

آپؐ کے در کے سوا کوئی ٹھکانہ ہے کہاں
ایسا محبوب جہاں بھر میں یگانہ ہے کہاں
بس اجازت ہو مجھے در پہ پڑے رہنے کی
اُٹھ کے جانے کا مرے پاس بہانہ ہے کہاں
آپؐ کا ساتھ ملا جس کو وہ بہتر ٹھہرا
آپ کا دور جو تھا ویسا زمانہ ہے کہاں
فاطمہؓ اور علیؓ آپؐ کی نسبت سے بلند
ایسا دنیا میں عظیم اور گھرانہ ہے کہاں
آپؐ معراج کی رفعت کے ہیں واحد حقدار
اہل دنیا یہ حقیقت ہے فسانہ ہے کہاں
آپؐ کی نعت سناتا ہوں زمانے بھر کو
میرے ہونٹوں پہ کوئی اور ترانہ ہے کہاں
آفتاب آپؐ کی محفل کا تمنائی ہے
اُس کے جیسا بھی کوئی اور دوانہ ہے کہاں

آفتاب خان/لاہور

سبز گنبد کے مکیں تجھ پر سلام
ساری دنیا سے حسیں تجھ پر سلام
دل تڑپتا ہے تمہاری یاد میں
جاؤں روضے کے قریں تجھ پر سلام
سنگریزے بھی مدینے پاک کے
ہیں نوادر سے حسیں تجھ پر سلام
جنت ارضی جسے کہتے ہیں لوگ
ہے مدینے کی زمیں تجھ پر سلام
سب رسولوں پر فضیلت ہے تجھے
اے رسولؐ آخریں تجھ پر سلام
شمسی کے آقا کو بلوایا گیا
برسرِ عرش بریں تجھ پر سلام

سیّد مبارک علی شمسی/قائم پور

یوں زندگی کا مان بڑھایا حسینؓ نے
جاں دے دی اور سر نہ جھکایا حسینؓ نے
کی تھی رسولؐ اور علیؓ نے جو تربیت
اپنے عمل سے اُس کو نبھایا حسینؓ نے
سر جب جھکے تمہارا تو اللہ کے سامنے
آئین زندگی یہ سکھایا حسینؓ نے
اقوام کی کتابِ عمل میں نہیں ہے جو
تاریخ میں وہ باب بڑھایا حسینؓ نے
یوں سربلند کر دیا حسنِ یقین کو
سجدے سے اپنا سر نہ اُٹھایا حسینؓ نے
ہیرے چمک رہے تھے بہتر جڑے ہوئے
میدانِ کربلا کو سجایا حسینؓ نے
ہر کربلا کے واسطے قانون ہے ندیمؔ
جو جا کے کربلا میں بنایا حسینؓ نے

ریاض ندیم نیازی/سبی

گزرتی جاتی ہے اک اور شب مدینے میں
حسینؓ لوٹ کے آئے گا کب مدینے میں
کوئی پتا تو کرے کیا ہوا امام کے ساتھ
اُداسی پھیل گئی ہے عجب مدینے میں
عجیب دکھ بھرے لہجے میں بین کرتی ہیں
ہوائیں رات کو چلتی ہیں جب مدینے میں
حسینؓ قافلہ لے کر چلا گیا کب کا
میں بدنصیب کہ پہنچا ہوں اب مدینے میں
حسینؓ ہیں نہ حسنؓ ہیں نہ فاطمہؓ نہ علیؓ
وہ دن بھی کیا تھے کہ ہوتے تھے سب مدینے میں

حسن عباسی/لاہور

پروفیسر محمد طاہر صدیقی /لاہور

روش روش جو مہکتے ہیں پھول گلشن میں
انھیں ملی ہے مہک آپؐ کے پسینے سے

جو سوئے طیبہ اُتر کے چلا سفینے سے
ندا یہ آئی کہ چلنا یہاں قرینے سے
ادب کی جا ہے، چلو یوں کہ چاپ بھی چپ ہو
قدم قدم پہ بچھے ہیں یہاں خزینے سے
طواف طیبہ میں رہتا ہے چودھویں کا چاند
اسے نہ دن سے غرض ہے نہ ہے مہینے سے
روش روش جو مہکتے ہیں پھول گلشن میں
انھیں ملی ہے مہک آپؐ کے پسینے سے
مرا خلوص مدینے میں مجھ کو لے آیا
میں شہرِ شاہؐ میں پہنچا وفا کے زینے سے
میں زائرین مدینہ کو جب بھی دیکھتا ہوں
وہ سارے سنورے سجے لگتے ہیں نگینے سے
قیام مسجد آقاؐ کا فیض کیا کہیے
حیات ہوگئی روشن بس اک مہینے سے
ہر اک کو ساقی کوثرؐ کا جام ملتا ہے
نہیں پلٹتا کوئی تشنہ لب مدینے سے
نبیؐ کے شہر کی کیونکر بیان ہو عظمت
ہے آب و تاب میں ذرّہ فزوں نگینے سے
درِ حضورؐ کی نسبت سے ہیں غنی طاہر
غرض نہیں ہے کسی شاہ کے خزینے سے

جس گھڑی میں روضۂ سرکارؐ پہ حاضر ہوا
رحمتوں کا، بخششوں کا، مجھ پہ در وا ہو گیا
ہر ورق پر پھیلتی جاتی ہے خوشبوئے ثنا
نوکِ خامہ کو نبیؐ کا ذکر مہکانے لگا

آپؐ ہی تھے، آپؐ ہی ہیں، آپؐ ہی ہوں گے سدا
تاجدارِ انبیاء، خیر البشرؐ، خیر الوریٰ
آپؐ کے القاب میں مضمر بڑی تسکین ہے
آپؐ کے اذکار ہیں راحت فزا، بہجت فزا
اب کسی تعویذ کی مجھ کو نہیں ہے احتیاج
نقشِ نعلینِ نبیؐ زیبِ گلو ہے کر لیا
راہِ طیبہ میں خلوص و عجز ہے زادِ سفر
بارگاہِ مصطفیٰؐ میں لے کے جاتی ہے وفا
مال و زر جائے کہ جان و دل، تذبذب ہی نہیں
عشقِ احمدؐ کا مرے دل پہ ہے چھایا یوں نشہ
ان پہ دشمن کا کوئی بھی وار چل سکتا نہیں
عشقِ احمدؐ کی زرہ پہنے ہوئے ہیں جو سدا
عشقِ سلطانِ دو عالمؐ میں فنا ہو جایئے
پایئے سرکارؐ کے اذکار سے حسنِ بقا
آپؐ کے دیدار کا طالب ہے طاہر ہر گھڑی
یا نبیؐ اس پر نگاہِ لطف ہو بہرِ خدا

آپؐ کے دم سے ہے زندگی یا نبیؐ
زندگی میں ہے سب دل کشی یا نبیؐ
گفتگو کا سلیقہ ملا آپؐ سے
نعت میں ڈھل گئی شاعری یا نبیؐ
آپؐ کی یاد میں جب بھی پرنم ہوئی
چشمِ تر کو ملی تازگی یا نبیؐ
اذنِ طیبہ ملے مجھ کو بار دگر
بڑھ گئی دید کی تشنگی یا نبیؐ
آپؐ سے بندگی کا قرینہ ملا
میری مقبول ہو بندگی یا نبیؐ
آپؐ کے اسوۂ پاک کے فیض سے
ہے بشر کو ملی آگہی یا نبیؐ
خلوتِ جاں کی پہنائیوں کو ملی
آپؐ کے نور سے روشنی یا نبیؐ
آپؐ کا ہے کرم آپؐ کی ہے عطا
پھول بننے لگے خار بھی یا نبیؐ
آپؐ کے در پہ جب ہوگئی حاضری
نہ رہی نعمتوں کی کمی یا نبیؐ
خوش نوا بلبلوں کے ترنم میں ہے
ہر گھڑی یا نبیؐ ہر گھڑی یا نبیؐ
آخری دم بھی طاہر کے ہونٹوں پہ ہو
یا نبیؐ یا نبیؐ یا نبیؐ یا نبیؐ

مری خوشی کا سبب ہے نبیؐ کی مدح ہی
غموں نے جب بھی ستایا تو میں نے نعت کہی
ہے اس طرح مری نس نس میں ان کی یاد بسی
کبھی عطائے جلی ہے کبھی عطائے خفی
گواہی دیتی ہیں گھڑیوں کی دھڑکنیں اب تک
چلے وہ جب شبِ اسریٰ تو نبضِ وقت رُکی
قدم قدم پہ بہاریں سلام کرتی رہیں
جدھر حضورؐ گئے ہیں ادھر بہار گئی
تقربِ اہلِ خرد کا کبھی نہ راس آیا
مصاحبت جو رہی ہے تو اہلِ دل سے رہی

عمران مفتی/میانوالی

آ گئی بادِ صبا چومنے ماتھا میرا　　میں نے عمرآن محبت میں جو اک نعت پڑھی

عمران مفتی کا نام جب میں نے پہلی بار سنا تو مجھے ممتاز مفتی اور عکسی مفتی یاد آ گئے اور میں حیران ہوا کہ میرے میانوالی میں مفتی خاندان کہاں سے آ گیا ہے۔مگر جب ملاقات ہوئی تو وہ علمی اور ادبی شخصیات کے حامل انسان اور سچ مچ کے مفتی لگے۔اب جبکہ اُن کا نعتیہ کلام میری نظر سے گزرا تو اُن کے عاشق رسول ﷺ ہونے کی خبر بھی قلب وجاں میں پھیل گئی۔یہ ہر حوالے سے حضرت محمد ﷺ کو محبت اور عقیدت میں گندھا ہوا نعتیہ مجموعہ ہے۔ایسے اشعار کی تعداد کم نہیں جن کو پڑھ کر روح معطر ہو جاتی ہے۔اللہ انھیں عزت اور منزلت عطا فرمائے۔میں ''ہو نگاہِ کرم'' کی اشاعت پر عمران مفتی کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔(منصور آفاق)

مرے دل میں جمالِ مصطفیؐ ہے
مرا دل صورتِ غارِ حرا ہے
تری فرقت سے کچھ ایسا لگا ہے
کہ دل میں دردِ اُلفت آ بسا ہے
دمِ آخر کرم کی اک نظر ہو
لبوں پر بس یہی اک التجا ہے
تری یادوں میں دل کھویا ہوا ہے
خبر دل کی نہ کچھ اپنا پتا ہے
نگہ اُٹھتی نہیں اوروں کی جانب
نظر پہ شوق کا پہرا لگا ہے
میں جاؤں سوئے طیبہ اس ادا سے
جو مقبولِ امام الانبیاء ہے
وہ جب تشریف لائے اس جہاں میں
چھٹی ظلمت اُجالا ہو گیا ہے
شبِ اسریٰ میں دیکھو شان اس کی
نبی سب مقتدی وہ مقتدا ہے
کوئی خالی نہ آیا اُن کے در سے
شہ بطحا کا کیا جود و سخا ہے
زمین و آسماں ہو لامکاں ہو
انھی کا حسن ہی جلوہ نما ہے
غمِ روزِ جزا عمران کیسا
ترا حامی تو محبوبِ خدا ہے

مظہر شانِ ستار میرا نبیؐ
سارے نبیوں کا سالار میرا نبیؐ
صاحبِ اعلیٰ کردار میرا نبیؐ
مالک حسنِ گفتار میرا نبیؐ
کوئی اس سے حسیں تھا نہ ہوگا کہیں
حق تعالیٰ کا شہکار میرا نبیؐ
اس کے دم سے گھٹا ظلمتوں کی چھٹی
ظلمتوں میں ضیا بار میرا نبیؐ
سب غلاموں کی بخشش کا بھی حشر میں
رب سے ہوگا طلب گار میرا نبیؐ
وہ گزر کہ معطر معطر ہوئی
آیا جس سمت اک بار میرا نبیؐ
وجہ آرائشِ گلستاں بھی ہے اور
روحِ گل اور گلزار میرا نبیؐ
میں یہ عمرآن رو رو کے مانگوں دُعا
خواب میں آئے اک بار میرا نبیؐ

اے زائرِ مدینہ جانا سنبھل سنبھل کر
راہِ درِ نبیؐ پر چلنا سنبھل سنبھل کر
درِ مصطفیؐ پہ جا کر رُکنا سنبھل سنبھل کر
پھر ان کی بارگہ میں جھکنا سنبھل سنبھل کر
قرآن میں خدا نے لَا تَرْفَعُوْا کہا ہے
کہنا سنبھل سنبھل کر سننا سنبھل سنبھل کر
یہ نعتِ مصطفیؐ ہے کوئی شاعری نہیں ہے
اے واصفِ نبیؐ تم لکھنا سنبھل سنبھل کر
عمرآن جب بھی آئے درِ پاک سے بلاوا
جانا سنبھل سنبھل کر آنا سنبھل سنبھل کر

مدحِ محبوبِ خدا اور کہاں میں عاصی
ان کے ہی لطف و کرم سے مجھے توفیق ملی
روح مضطر ہو تو ہے ذکر ترا اس کا علاج
دل کی بے چینی کا ہے چین فقط یاد تری
لوٹ آیا ہوں میں روضے کی زیارت کر کے
روح تو آج بھی لیکن ہے اسی در پہ کھڑی
عقدے اُلجھے ہوئے آ کر تری باتوں سے کھلے
بات بگڑی ہوئی آ کر ترے قدموں میں بنی
رفعتِ ذاتِ نبیؐ عقل سے بالا سمجھو
عشق نے آ کے مرے کانوں میں یہ بات کہی
ہر دو عالم میں تری نعت کی توفیق ملے
تیری سرکار میں اتنی سی گزارش ہے مری
سارے اعمال کی بربادی کا ہے یہ بھی سبب
اُن کے دربار میں اونچی اگر آواز ہوئی
آ گئی بادِ صبا چومنے ماتھا میرا
میں نے عمرآن محبت میں جو اک نعت پڑھی

مضمون

تنقید کیا ہے؟

پروفیسر آل احمد سرور

مغرب کے اثر سے اردو میں کئی خوش گوار اضافے ہوئے۔ ان میں سب سے اہم فن تنقید ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مغرب کے اثر سے پہلے اردو ادب میں کوئی تنقیدی شعور نہیں رکھتا تھا یا شعر و ادب کے متعلق گفتگو، شاعروں پر تبصرہ اور زبان و بیان کے محاسن پر بحث نہیں ہوتی تھی۔ بڑے تخلیقی کارنامے بغیر ایک اچھے تنقیدی شعور کے وجود میں نہیں آسکتے۔ تخلیقی جوہر بغیر تنقیدی شعور کے گمراہ ہو جاتا ہے اور تنقیدی شعور بغیر تخلیقی استعداد کے بے جان رہتا ہے۔ اردو میں وجہی سے لے کر حسرت موہانی تک ہر اچھے شاعر کا ایک واضح اور کارآزمودہ تنقیدی شعور بھی ہے۔ پھر بیاضوں، تذکروں، تقریظوں، دیباچوں اور مکاتیب کا سرمایہ شروع سے موجود ہے۔ مشاعروں اور ادبی صحبتوں میں شعر و شاعری اور فکر و فن پر تبصرے برابر ہوتے رہتے ہیں۔ میر، جرأت کی چوما چاٹی سے بے زار تھے۔ خان آرزو و سودا کے شعر کو "حدیثِ قدسی" کہتے تھے، آتش، دبیر کے مرثیوں کو لندھور بن سعد کی داستان بتاتے تھے۔ شیفتہ، نظیر کے کلام کو سوقیانہ ٹھہراتے تھے اور اسلوب میں متانت کے اس قدر قائل تھے کہ کیسے ہی معنی ہوں، متانت کے بغیر نامقبول سمجھتے تھے۔ غالب کے نزدیک شاعری معنی آفرینی تھی، قافیہ پیمائی نہیں۔ وہ شعر میں "چیزے دگر" کے بھی قائل تھے اور آتش کے یہاں ناسخ سے تیز تر نشتر پاتے تھے۔ یہ تنقیدی شعور بعض اچھی روایات کا حامل تھا۔ اسمیں فن کی نزاکتوں کا احساس تھا اور اس کی خاطر ریاض کرنے کا التزام۔ یہ قدرے محدود اور روایتی تھا اور ضبط و نظم کا ضرورت سے زیادہ قائل۔ یہ ہر نشیب و فراز کو ہموار کرنا چاہتا تھا۔ اور ہر ذہن کو ایک ہی سانچے میں ڈھالنا چاہتا تھا۔ یہ بات اشاروں میں کرتا تھا، وضاحت، صراحت، تفصیل کا قائل نہ تھا۔ اس میں مدح ہوتی تھی یا قدح اس کا معیار ادبی کم تھا، فنی زیادہ۔ اس میں کلام نہیں کہ تنقید صحیح معنی میں حالی سے شروع ہوئی۔ حالی سے پہلے شاعر استادوں کو مانتے تھے، نقادوں کو نہیں۔ ان سے پہلے کسی میں اعلا درجے کی تنقیدی صلاحیت اگر ملتی ہے تو وہ شیفتہ ہیں جن کی پسند کے بغیر غالب بھی غزل کو غزل نہیں سمجھتے تھے، مگر وہ بھی مانوس اور مہر کردہ حسن کے قائل ہیں، حسن کو خود دریافت نہیں کر سکتے۔ حالی نے شاعری، ادب، زندگی، اخلاق، سماج، غزل اور نظم کے متعلق اصولی سوال کیے۔ انہوں نے شاعری کا ایک معیار متعین کرنا چاہا اور اس معیار سے ہمارے ادبی سرمائے کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ اس معیار میں وہ مغرب سے بھی متاثر ہوئے۔ اگرچہ ان کا معیار خالص مغربی نہ تھا۔ اس میں انہوں نے فن کا بھی لحاظ رکھا، مگر فطرت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ انہوں نے بعض روایات پر نکتہ چینی کی مگر مجموعی طور پر ادب کی روایات کو نظر انداز نہیں کیا۔ حالی کا یہ طریقہ مفید ثابت ہوا اور تنقید اور اس کے اصول پر گفتگو شروع ہو گئی۔ چنانچہ اردو میں اس قسم کے مضامین، رسالے اور کتابیں بکثرت ہیں جن میں تنقید کے اصولوں پر بحث کی گئی ہے یا بعض ادیبوں یا ادبی تحریکوں پر تنقید ہے یا کسی ادبی اصول کی تشریح و تفسیر ہے۔ مغرب میں تنقید نے کئی کروٹیں بدلی ہیں اور ان کا اثر بھی ہمارے یہاں محسوس ہو رہا ہے پھر بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ تنقید کے

> حالی نے شاعری، ادب، زندگی، اخلاق، سماج، غزل اور نظم کے متعلق اصولی سوال کیے

مفہوم، منصب، اس کی ضرورت، اس کی بنیادی شرائط، اس کے میدان اور خصوصیات کے متعلق آج بھی بہت غلط فہمیاں عام ہیں۔ اس لیے واضح کرنے کی اب بھی بڑی ضرورت ہے کہ تنقید کیا ہے اور ادب اور زندگی میں اس کی کیا اہمیت ہے؟

کولرج نے ایک جگہ ایک مرد اور ایک عورت کا ذکر کیا ہے جو کسی آبشار کا نظارہ کر رہے تھے۔ مرد نے کہا۔ "یہ کیسا جلال رکھتا ہے؟" عورت نے جواب دیا۔ "ہاں بہت خوب صورت ہے۔" یہ نہ تھا کہ بچاری عورت حُسن کا احساس نہ رکھتی ہو۔ احساس تھا، ذوق نہ تھا، شعور تھا مگر تربیت یافتہ اور مہذب نہ تھا۔ اس لیے حُسن اور حُسن میں فرق نہ کر سکتی تھی اور دلبری اور قاہری کے فرق کو نہیں جانتی تھی یا جانتی تھی تو بیان نہ کر سکتی تھی۔ یہ مرض عوام ہی میں نہیں خواص میں بھی ہے کتنے ہی بزرگ "نظارے" سے نہیں، ذوق سے سروکار رکھتے ہیں۔ وہ چیزوں کا حُسن نہیں دیکھتے۔ ان چیزوں میں ایک خاص خیال کا حُسن دیکھتے ہیں۔ اب بھی کتنے ہی ترقی پسند ادب اور نئے ادب کو ایک ہی چیز سمجھتے ہیں۔ کتنے ہی حُسن کو ایک خاص لباس میں

دیکھتے ہیں اور لباس کو حسن سمجھتے ہیں کتنے صرف روایات کے پجاری ہیں۔ کتنے صرف بغاوت کے علم بردار۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو فانی وجگر کی طرح غزل کو اصل شاعری سمجھتے ہیں اور نظم کو محض قافیہ پیمائی۔ کچھ کلیم الدین کی طرح غزل کو نیم وحشیانہ صنف شاعری کہتے ہیں۔ کچھ کرشن چندر کی طرح ہیں جو راشد کی شاعری میں فرار، جنسی الجھنیں دیکھتے ہوئے بھی اس کی ترقی پسندی پر اصرار کرتے ہیں۔ کچھ انقلابی شاعری کے معنی بغاوت اور خون کی ہولی کے لیتے ہیں۔ کچھ اختر رائے پوری کی طرح اپنے جوش میں اکبر کے کلام کو طنزیہ تک بندی کہہ جاتے ہیں۔ کچھ ادب کو پروپیگنڈا بنانا چاہتے ہیں۔ کچھ اصول بناتے ہیں مگر ان پر عمل نہیں کرسکتے اور کچھ علیحدہ علیحدہ تصویریں اچھی بنا لیتے ہیں مگر کثرت میں وحدت نہیں دیکھ سکتے۔ اس افراط و تفریط کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ادب کو دراصل ادب کم رہنے دیا گیا ہے یا اسے تصوف اور فلسفہ بنایا گیا ہے یا پروپیگنڈا۔ ظاہر پرستوں نے اقبال کی زبان میں اس کے ''اندرون'' کو نہیں دیکھا، اسے محض فن سمجھا، اس کے خون جگر کی رنگینی کو نظر انداز کیا۔ دوسروں نے ردعمل کے طور پر فن کے نکات کو نظر انداز کرنا چاہا اور اس طرح اپنی بات کا وزن کھو بیٹھے۔ اردو میں تنقیدیں اچھی اچھی لکھی گئیں مگر صحیح تنقید جس کا راستہ بال سے زیادہ باریک ہے، اسی وجہ سے زیادہ ترقی نہ کرسکی۔ مختلف ٹولیوں نے اسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ اس کی خاطر ریاض کم کیا۔ حالی کے بعد اردو میں کوئی ایسا نقاد نہیں ہے جو ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے الفاظ میں آفاقی ذہن (Universal intelligence) رکھتا ہو۔ آفاقی ذہن سے مراد بین الاقوامی نہیں ہے۔ کتنے ہی نقاد اپنے حقیقی منصب کو بھلا کر دنگل میں داد شجاعت دینے لگے۔ کتنے ہی فلسفہ بگھارنے کے شوق میں رسوا ہوئے۔ کتنے ہی آمریت پر اتر آئے۔ کتنے ہی ایک اسکول، ایک دور، ایک روایت کے ترجمان ہو کر رہ گئے۔ نظریے اچھے اچھے پیش کیے گئے مگر ایسے جو تین سو سال پہلے کی شاعری، آج کی اور تین سو سال بعد کی شاعری، تینوں کے مطالعہ میں مدد دے سکیں۔ چاہے حرف آخر نہ ثابت ہوں۔ افسوس ہے کہ اردو میں کوئی ارسطو پیدا نہ ہوا۔ حالی کی مشرقیت اور ان کی شرافت بعض اوقات معاصرین پر اظہار رائے میں انہیں ضرورت سے زیادہ نرم بنا دیتی تھی۔ بقول برنارڈ شا کے، ادیب کو پہلے ادب کا خیال کرنا چاہیے۔ بعد میں شرافت اور مروت کا۔ مقدمے اور مقالات کے حالی میں یہی فرق ہے۔

> انتخاب تنقید تو نہیں ہے مگر انتخاب سے تنقیدی شعور ضرور ظاہر ہوتا ہے

اردو میں تنقید کی کمی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ تنقید کو عام طور پر دوسرے درجہ کی چیز سمجھا گیا ہے۔ علی گڑھ میں میرے ایک کرم فرما ہیں جو کوئی تنقید پڑھتے ہیں تو فرماتے ہیں ''یہ بات کیا ہوئی؟ کچھ اشعار لکھے، کچھ ان کا خلاصہ بیان کیا، افتتاحی الفاظ یا حواشی بڑھائے اور تنقید تیار ہوگئی۔'' اس میں کوئی شک نہیں کہ ادبی رسالوں میں ایسی تنقیدیں کثرت سے ملتی ہیں۔ اس کی بنیادی شرائط اس کے میدان اور خصوصیات کے متعلق آج بھی بہت سی غلط فہمیاں عام ہیں۔ شبلی نے موازنہ انیس و دبیر میں طویل طویل اقتباسات اس لیے دیے تھے کہ مرثیوں کی خوبی کا اندازہ دو ایک بندوں سے نہیں ہوسکتا۔ اقبال کے بہت سے نقادوں نے اقبال کے اشعار زیادہ لکھے،

> اچھی تنقید تخلیقی ادب کی طرف مائل کرتی ہے۔ وہ خود تخلیقی ہوتی ہے۔ وہ پڑھنے والے کے ذہن پر مہر نہیں لگاتی۔ اس کے ذہن کی تربیت کرتی ہے۔

اپنے خیالات کم بیان کیے۔

انتخاب تنقید تو نہیں ہے مگر انتخاب سے تنقیدی شعور ضرور ظاہر ہوتا ہے۔ انتخاب میں اپنی پسند سے زیادہ شاعر کی نمائندگی ضروری ہے۔ شاعر کی نمائندگی آسان کام بھی نہیں ہے مگر جو لوگ اقتباسات کی کثرت سے بدگمان ہو جاتے ہیں انہیں یہ سوچنا چاہیے کہ تنقید ہوائی نہیں ہوسکتی، اقتباسات تنقید کو صحت سے قریب رکھتے ہیں۔ جو لوگ اقتباسات کو دیکھ سکتے ہیں، اس تلاش وجستجو کو نظر انداز کردیتے ہیں، جو اقتباسات میں صرف ہوتی ہے اور ہونی چاہیے وہ ادب کا کوئی اچھا تصور نہیں رکھتے اور ان کی ذہنی استعداد کے متعلق کوئی اچھی رائے نہیں قائم کی جاسکتی۔ اب بھی کچھ لوگ اس کے قائل ہیں کہ تخلیقی ادب براہ راست زندگی کے شعور کو ظاہر کرتا ہے اور تنقیدی ادب چونکہ اس تخلیق کی ترجمانی، تحلیل یا تجزیے کا فرض انجام دیتا ہے، اس لیے اس کی برابری نہیں کرسکتا۔ ان کے نزدیک جس ادب سے کتابوں کی زیادہ اور تخلیق کی کم مہک آئے وہ چنداں اہم نہیں۔ بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ چونکہ نقاد خود شاعر کم ہوتے ہیں اور اگر ہوتے ہیں تو اچھے شاعر نہیں

ہوتے، اس لیے ان کی رائے پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ آخر یہ کبوتران بام حرم، مرغان رشتہ بر پا کے متعلق کیا جان سکتے ہیں اور کیا بتا سکتے ہیں۔ ان دونوں تصورات پر غور کرنا ہمارا فرض ہے۔

اقبال کی شاعری پر یوسف حسین نے ''روح اقبال'' لکھی جس میں ان کے کلام کی ترجمانی کی کوشش کی۔ کسی نے روح اقبال پر تنقید لکھی جس میں یوسف صاحب کے نظریے سے اختلاف کیا۔ کسی نے اس اختلاف سے اختلاف کیا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تعبیروں کی کثرت سے بعض اوقات خواب پریشاں ہو جاتا ہے۔ ٹیگور پر بھی ایک دفعہ یہی واقعہ گزرا تھا۔ انہوں نے اپنے حلقے میں ایک نئی نظم سنائی۔ ایک صاحب نے کہا اس کا یہ مطلب ہے۔ دوسرے نے کہا یہ نہیں یہ ہے۔ اس پر دونوں میں بحث ہونے لگی اور ٹیگور بیچ میں سے غائب ہو گئے۔ ہمارے قدیم نظام تعلیم میں شرحوں، حاشیوں اور تفسیروں کے سمجھنے کا جو دستور تھا اس کی وجہ سے جزوی چیزیں اصل سے زیادہ اہمیت اختیار کر لیتی تھیں اور نظر محدود ہو جاتی تھی۔

شاعری کے لیے ایک شیریں دیوانگی اور تنقید کے لیے ایک مقدس سنجیدگی کی ضرورت ہوتی ہے

ذاتی، شخصی اور داخلی تنقیدوں میں اس قسم کا امکان ضرور ہے کبھی کبھار یہ بھی ہوتا ہے کہ نقاد کی غیر معمولی شخصیت اس کے شان دار اصول اور دلچسپ فقرے پڑھنے والے کو مرعوب کر دیتے ہیں۔ وہ نقاد کی عینک سے ہر چیز کو دیکھنے کا عادی ہو جاتا ہے (گو عام پڑھنے والوں کے لیے ایسے ذہنی رفیق بہتر ہیں بجائے اس کے کہ وہ ادبی نراج کا شکار ہوں) مگر اچھی تنقید تخلیقی ادب کی طرف مائل کرتی ہے۔ وہ خود تخلیقی ہوتی ہے۔ وہ پڑھنے والے کے ذہن پر مہر نہیں لگاتی۔ اس کے ذہن کی تربیت کرتی ہے۔ تخلیقی ادب پر کوئی تنقید، تخلیقی ادب سے بے نیاز نہیں کر سکتی۔ دونوں کے درمیان کوئی خلیج نہیں ہے۔ تخلیقی ادب میں تنقیدی شعور کی کار فرمائی ہوتی ہے۔ تنقید اس کو واضح کر دیتی ہے۔ تنقید خلاصہ یا تنقیص نہیں ہے مگر اس کا تخلیق کے بنیادی خیال تک پہنچنا ضروری ہے۔ یہ تخلیق پر عرف عام میں عمل جراحی بھی کرتی ہے۔ مگر یہ عمل شاعرانہ طور پر ہوتا ہے اور اسی فضا کے اندر رونما ہوتا ہے۔

تنقید کی طرف سے بدگمانی عام طور پر ان لوگوں کو ہوتی ہے جو ادب کو بہت گہری نظر سے دیکھنے کے عادی نہیں ہیں، جو اس میں صرف تفریح یا اقبال کے الفاظ میں کو کنار کی لذت ڈھونڈتے ہیں۔ اگر وہ سطحی فرق کو نظر انداز کر دیں اور غور کریں تو انہیں معلوم ہو جائے کہ تخلیقی ادب کی زندگی کے لیے کتنا ضروری ہے کہ وہ تنقیدوں سے مدد لے۔ بعض اوقات بدگمانی اس وجہ سے بھی ہوتی ہے کہ تبصروں، دیباچوں، مقدموں اور تعارفوں میں عام طور پر جو تنقید ملتی ہے اس میں تنقید کے علاحدہ علاحدہ رنگ ہیں۔ دراصل ان میں سے ہر ایک کا میدان الگ ہے۔ دیباچہ یا تعارف، کتاب یا صاحب کتاب کا تعارف کرتا ہے۔ اس کی اہمیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس کی قدر و قیمت متعین نہیں کرتا۔ متعین کرنے میں مدد دیتا ہے۔ مقدمہ اس سے ذرا آگے بڑھ جاتا ہے۔ وہ قدر و قیمت بھی متعین کرتا ہے اور قول فیصل بھی پیش کر دیتا ہے۔ تبصرہ یا ریویو بعض اہم خصوصیات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ مگر عام طور پر مقدموں میں بالغ نظری سے زیادہ شرافت کا ثبوت دیا جاتا ہے ان میں سے اکثر یقیناً گمراہ ہوتے ہیں۔ محدود تنقید تو خیر محدود قسم کی ہوتی ہے۔ زیادہ مضر نہیں ہوتی لیکن وہ تنقید جس میں دعویٰ جامعیت کا کیا جائے مگر ہو محدود اور مخصوص، گمراہ کن اور پر فریب ہے۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ داخلی تنقید میں اس قسم کا فیصلہ ناگزیر ہے اور یہ فریب مشرق مغرب میں بہت عام ہے۔ اس لیے میں داخلی تنقید کو ناقص تنقید کہتا ہوں وہ تحسین Appreciation کے درجے میں آتی ہے۔ اس کی علاحدہ قدر و قیمت ہے مگر اسے بڑی تنقید کا درجہ نہیں مل سکتا۔ بڑی تنقید تخلیقی ادب سے کسی طرح کم تر نہیں ہوتی بلکہ وہ خود تخلیق ہو جاتی ہے۔

رہا یہ سوال کہ جو نقاد شاعر نہیں ہوتے، وہ شاعری کے متعلق کیا بتا سکتے ہیں یا جو ناولسٹ نہیں، وہ ناول کے متعلق کیا رائے قائم کر سکتے ہیں، تو یہ سوال ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ مولوی عبدالحق کے متعلق دنیا جانتی ہے کہ وہ شاعر نہیں لیکن یہ بات ان کے ایک اچھے نقاد ہونے میں خلل انداز نہیں تھی۔ جگر ایک اچھے شاعر ہیں مگر وہ ایک اچھے نقاد نہیں کہے جاسکتے۔ شاعری کے لیے ایک شیریں دیوانگی اور تنقید کے لیے ایک مقدس سنجیدگی کی ضرورت ہوتی ہے۔ آرنلڈ نے اس کو High Seriousness کہا ہے۔ کبھی کبھی یہ دونوں چیزیں ایک ہی شخص کے یہاں مل جاتی ہیں۔ ہر اچھا شاعر ایک فنی شعور بھی رکھتا ہے۔ مگر یہ فنی شعور اسے ادب کے دوسرے اصناف کی قدر و قیمت متعین کرنے میں چنداں مدد نہیں دیتا۔ بلکہ ایک رکاوٹ ہی ثابت ہوتا ہے۔ ایک شعبے کی طاقت

دوسرے کی کمزوری ہو ہی جایا کرتی ہے۔ غزل کے شاعر اکثر نظم کی تعمیری صلاحیتوں کا اندازہ نہیں کرپاتے۔ اشاروں کے دلدادہ تفصیل اور صراحت اور وضاحت کے حسن کو نہیں دیکھ پاتے۔ جس گہرائی اور سپردگی کی تخلیق میں ضرورت ہوتی ہے، تنقید میں اس سے ابھرنا بھی ہوتا ہے۔ ہر فن کار کی شخصیت کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ایک حصہ تجربہ حاصل کرتا ہے، دکھ بھوگتا ہے اور تکلیف اٹھاتا ہے یا راحت اور مسرت حاصل کرتا ہے، دوسرا رنج و راحت کو ذرا بلندی سے دیکھتا ہے اور اس کی قدر و قیمت متعین کرتا ہے۔ اس لیے اگر فن کار بعض اوقات اپنے رنج و راحت کو ذرا بلندی سے دیکھ پائے۔ تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے مگر اس سے نقاد کی اہمیت اور عظمت کم نہیں ہوتی اور مسلم ہو جاتی ہے۔ میر نے نکات الشعرا میں اپنا جو انتخاب کیا ہے اس سے میر حسن کا انتخاب اچھا ہے۔ جنوری، ۱۹۳۱ء کے ''نگار'' میں شاعروں نے اپنا جو انتخاب کیا تھا وہ یقیناً ہر جگہ کلام کا بہترین انتخاب نہیں تھا۔ اس لیے یہ بات واضح ہے کہ نقاد شاعر نہ ہوتے ہوئے بھی، یا اونچے پایے کا شاعر نہ ہوتے ہوئے بھی اچھا نقاد ہو سکتا ہے ہاں اس کے لیے سخن فہم ہونا ضروری ہے۔ اس کے لیے اس روح تک پہنچنا ضروری ہے جو شاعری کی ہے۔ اس کے یہاں اس وسیع ہمدردی کی، اس لچک دار ذہن کی، اس ہمہ گیر طبیعت کی موجودگی ضروری ہے جو شاعر کی فضا میں شاعر کے ساتھ بلکہ اس سے آگے بھی پرواز کر سکے۔ فن کار تجربوں کو جنم دیتا ہے سخن فہم نقاد فن کاروں کو صحیح معنی میں فن کار بناتا ہے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے غلط نہیں کہا ہے کہ ''جب ایک تخلیقی ذہن دوسرے سے بہتر ہوتا ہے تو اکثر اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ جو بہتر ہوتا ہے وہ تنقیدی صلاحیت زیادہ رکھتا ہے۔'' ہڈسن نے تو صاف کہا ہے کہ ''سچی تنقید بھی چونکہ اپنا مواد اور جذبہ زندگی سے لیتی ہے اس لیے اپنے رنگ میں وہ بھی تخلیق ہے۔'' اس لیے تنقیدی ادب سے اس وجہ سے بھڑکنا کہ وہ ''کتابوں کی مہک رکھتا ہے'' صحیح نہیں۔ اچھی تنقید کسی طرح بھی تخلیق سے کم نہیں، بلکہ بعض وجوہ سے اس پر فوقیت رکھتی ہے۔

غرض تنقید کو دوسرے درجے کی چیز سمجھنا ایک بہت بڑی غلطی ہے۔

> **تنقید کے بغیر ادب ایک ایسا جنگل ہے جس میں پیداوار کی کثرت ہے، موزونیت اور قرینے کا پتا نہیں**

اچھی تنقید محض معلومات ہی فراہم نہیں کرتی بلکہ وہ سب کام کرتی ہے جو ایک مورخ، ماہر نفسیات، ایک شاعر اور ایک پیغمبر کرتا ہے۔ تنقید ذہن میں روشنی کرتی ہے اور یہ روشنی اتنی ضروری ہے کہ بعض اوقات اس کی عدم موجودگی میں تخلیقی جوہر ہمیں کسی شے کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ انیسویں صدی کے شروع کا زمانہ انگلستان میں کس قدر غیر معمولی تخلیقی پیداوار کا زمانہ تھا مگر آرنلڈ کے نزدیک یہ شاعری باوجود اس قدر خلاقی کے، ذہن نہ رکھتی تھی، جانتی نہ تھی۔ اس کے بڑے بڑے شاعر یا تو کم سرمایہ تھے یا مبہم یا ان میں تنوع اور رنگارنگی کی کمی تھی۔ یہ بات ہماری شاعری پر بھی ایک بڑی حد تک صادق آتی ہے۔ ہمارا قدیم ادب مغز رکھتا ہے۔ اس میں تنوع کی بھی کمی ہے۔ مگر فن کے ایک خاص شعور کی وجہ سے یہ مبہم نہیں ہے۔ ہمارا جدید ادب اس کے مقابلے میں مغز بھی رکھتا ہے اور وزن بھی اور تنوع بھی مگر اس میں ابہام زیادہ ہے۔ پہلے چاشنی یا چٹخارے پر زور تھا، اب سنسنی پھیلانے یا چونکانے پر توجہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اول تو ذہن زیادہ نمایاں نہیں ہے، جذبہ زیادہ نمایاں ہے دوسرے ذہن میں روشنی کم ہے، دھندلکا یا الجھن زیادہ۔ (اس الجھن کے وجوہ اور ہیں، تنقید کی وجہ سے یہ الجھن نہیں)۔ ذہن اور جذبے کے فرق پر ماہرین نفسیات مسکرائیں گے۔ مگر میں نے ان کو یہاں متعارف معنی میں استعمال کیا ہے۔ ممکن ہے کہ کچھ لوگ ہیرس کی طرح صرف جذبے ہی کو شاعری سمجھتے ہوں، مگر میں فکر و جذبے کی ہم آہنگی ضروری جانتا ہوں۔ ادب میں علم اور علمیت کی کمی اس علم میں تہذیب و تربیت کی کمی (یہاں محض کتابوں کا علم نہیں بلکہ زندگی اور کائنات کا علم مراد ہے) تنقیدی شعور کی طرف توجہ نہ کرنے اور ذوق کی صحت و اصلاح سے بے نیاز رہنے کی برکت ہے۔

ہر انسان میں حسن سے متاثر ہونے اور حسن کاری کا اثر قبول کرنے کی تھوڑی بہت صلاحیت ہوتی ہے مگر ہر شخص کا ذوق، مہذب، پختہ ہوتا ہے۔ کچھ لوگوں کی ذہنی نشوونما ان کی عمر کے ساتھ نہیں ہوتی۔ کچھ کو غم دوراں اس نشوونما کا موقع نہیں دیتا کچھ ادب میں سستا نشہ ڈھونڈتے ہیں اور اس پر قانع ہو جاتے ہیں، جس طرح کتنے ہی تن آسانی کی زندگی بسر کرتے ہیں اور درد و داغ و سوز و سام آرزو و جستجو، اقبال کے ابلیس کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ 'بیسویں صدی'، 'مست قلندر'، 'کہکشاں' اور اس قسم کے دوسرے رسالوں کی مقبولیت کا یہی راز ہے۔ مگر یہاں میرا خطاب ان لوگوں سے نہیں جو ادب میں بے ادبی کی تلاش کرتے ہیں بلکہ ان سے جو ادب کے ذریعے

سے آلامِ روزگار کو آسان ہی نہیں بناتے، آلامِ روزگار سے کش مکش کا حوصلہ پیدا کرتے ہیں اور انسانیت اور زندگی کے امکانات کو بلند کرتے ہیں۔ یہ لوگ اچھے ادب سے محظوظ ہوتے ہیں، کسی ادبی شخصیت کے دو چار ہونے سے، کسی ادبی کارنامے یا کسی ادبی فتح یاب سے آشنا ہونے سے انہیں مسرت حاصل ہوتی ہے لیکن ان کی اس مسرت اور خوشی میں تحسین اور تعریف کا رنگ غالب ہوتا ہے۔ کسی دوسرے ادبی کارنامے سے دوچار ہونے پر یہ تحسین دوسرا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ اس تحسین میں توازن نہیں ہوتا۔ یہ گمراہ بھی ہو سکتی ہے۔ اس لیے ہر نئی دریافت کو، اس کی مناسب جگہ دینا، ہر نئے سچ کو زندگی کو بڑی صداقت کے سانچے میں سمونا، جھوٹ کو پہچاننا، جب وہ سچ کا قالب پہن کر سامنے آئے اور بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ گویا تنقید ادیبوں، ادب سے مسرت اور خیر و برکت حاصل کرنے والوں اور خود ادب کے لیے ایک شغلِ ہدایت ہے۔ یہ اس خوشی کو جو سچے ادب سے حاصل ہوتی ہے نشاطِ زندگی کا ایک وسیلہ بناتی ہے۔ ادب میں حسن کے احساس کے اثر سے مادی زندگی کے حسن کا بہتر احساس دیتی ہے اور اس طرح زندگی کی ایک طاقت بن جاتی ہے۔

تنقید کے منصب کو واضح کرنے کے بعد اب یہ دیکھنا ضروری ہے کہ تنقید کا کام کیا ہے؟ یہاں بھی ہمیں مشرق و مغرب کے سرمایے میں مختلف نظریے، سیکڑوں اقوال اور ہزاروں الگ الگ رجحان دکھائی دیتے ہیں۔ تنقید کا کام فیصلہ ہے۔ تنقید دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دیتی ہے۔ تنقید وضاحت ہے، تجزیہ ہے۔ تنقید قدریں متعین ہے۔ ادب اور زندگی کو ایک پیمانہ دیتی ہے۔ تنقید انصاف کرتی ہے۔ ادنیٰ اور اعلیٰ، جھوٹ اور سچ، پست اور بلند کے معیار قائم کرتی ہے۔ تنقید ہر دور کی ابدیت اور ابدیت کی عصریت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ تنقید ادب میں ایجاد کرنے اور محفوظ رکھنے دونوں کا کام انجام دیتی ہے۔ وہ بت شکنی بھی کرتی ہے اور بت گری بھی۔ تنقید کے بغیر ادب ایک ایسا جنگل ہے جس میں پیداوار کی کثرت ہے، موزونیت اور قرینے کا پتا نہیں۔ یہ اور اس قسم کی بہت سی باتیں کہی جا سکتی ہیں اور ان میں سے کوئی بات بالکل غلط نہیں ہے۔ اگر اچھے نقادوں کی فہرست پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ کچھ نقاد فیصلے کی طرف مائل رہے ہیں، کچھ تجزیے اور تحلیل پر زور دیتے رہے ہیں۔ کچھ ترجمانی کا حق ادا کرتے رہے ہیں اور غیر جانب داری مشکل ہی نہیں، قریب قریب ناممکن بھی ہے۔ تنقید محض تصویر کے دونوں رخ دکھانے کا نام نہیں ہے نہ اس میں آدمی مفاہمت یا مصالحت کی کوشش کرتا ہے اور نہ عیب ڈھونڈتا رہتا ہے بلکہ دونوں پہلوؤں پر نظر رکھنے کے بعد کسی کی اہمیت کا اعتراف ضروری ہے۔ لفظی تنقید بھی، تنقید کی معمولی قسم ہے۔ الفاظ کے اندر فن کا جو شعور اور فن میں حیات و کائنات کا جو احساس ہے وہ زیادہ ضروری ہے۔ فاعلاتن فاعلات کی گردان اگرچہ تنقید نہیں ہے مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ کوئی بھی اچھا نقاد عروض اور اس کے قواعد سے بے نیاز ہو سکتا ہے۔ ادب کا اچھا نقاد زبان کا بھی اچھا نباض ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف عروض، روز مرہ اور محاورے سے واقف ہوتا ہے بلکہ یہ بھی جانتا ہے کہ بعض اوقات ان کی طرف توجہ نہ کرنے کے باوجود اچھی اور بڑی شاعری ممکن ہے۔ افسانہ نگاری میں اب بھی کچھ لوگ انشائے لطیف تلاش کرتے ہیں اور بیدی کی غیر معمولی فنی بلندی سے اسی لیے انکار کر دیتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں۔ شاعری میں بھی روتی سے لے کر اقبال تک محض شاعری کو سب نے اپنے اوپر تہمت قرار دیا ہے۔ محض شاعری سے یہاں غالباً محض فن کی بہار مراد ہے۔

نقاد کے لیے ضروری ہے کہ ماضی کے کسی کارنامے کا تجزیہ کرتے وقت وہ خود ماضی میں پہنچ جائے

زبان کے اس علم کے بعد اسالیب کا علم بھی ضروری ہے اور ہر اسلوب میں خلوص، انفرادیت، بیان اور حسنِ بیان کا احساس بھی۔ زبان و بیان کے حسن سے آب و رنگ آ سکتا ہے۔ روح نہیں آ سکتی۔ پہلی چیز مواد کی صحت یا واقعات کی صداقت ہے۔ اگر نقاد یہ علم نہیں رکھتا یا اس کا علم ناقص ہے تو اس کی بنیادیں ناقص ہیں، یہی وجہ ہے کہ جدید تنقیدوں میں بہ کثرت غلطیاں ناواقفیت یا غلط فہمی کی وجہ سے ملتی ہیں۔ نقاد محض واقعات تو بیان نہیں کرتا۔ اس لیے وہ مسل بندی پر مجبور نہیں ہے۔ اور تنقید ہرگز مسل بندی یا واقعات کی کھتونی نہیں ہے۔ مگر واقعات کے صحیح بیان اور صحیح احساس کے بغیر، یعنی صحیح تاریخی شعور کے بغیر اس کا ہر قدم اسے ترکستان کی طرف لے جائے گا۔ نقاد کے لیے ضروری ہے کہ ماضی کے کسی کارنامے کا تجزیہ کرتے وقت وہ خود ماضی میں پہنچ جائے۔ ماضی سے منہ موڑ کر بیٹھنا کسی حال میں صحیح نہیں۔ جدید تنقید میں پہلی کمزوری یہ ہے کہ وہ بعض واقعات کو نظر انداز یا مسخ کر دیتی ہے۔ اور اپنے خلاف باتیں سننا گوارا نہیں کرتی۔ دوسری کمزوری یہ ہے کہ ماضی کا صحیح احساس نہیں رکھتی۔ اگرچہ ہمارے ادب میں ماضی پرستی بہت زیادہ رہی ہے اور برسوں شاعروں اور

ادیبوں کے سامنے ایجاد کے بجائے تقلید، اپج کے بجائے رسمی اور روایتی اسلوب اور ادب کے بجائے فن زیادہ اہم رہا ہے۔ مگر اس کے معنی یہ نہ ہونا چاہئیں کہ ہم "جلا ہے" کی ضد میں ماضی کے کارناموں سے بالکل بے نیازی برتیں۔ ترقی پسند تنقید شروع میں تبلیغ زیادہ تھی تنقید کم، اس لیے کہ ماضی کی قدر کرنا اس نے اس وقت تک نہ سیکھا تھا۔ اب جو تنقیدیں لکھی جا رہی ہیں، ان میں تاریخی شعور، تسلسل کا لحاظ اور ماضی کا صحیح احساس ملتا ہے۔ اچھی تنقید محض کلاسیکل یا رومانی کے پھیر میں نہیں پڑ سکتی۔ وہ اس طرح تنگ خانوں میں نہیں بٹ سکتی۔ کتنے ہی نقاد اب بھی شاعروں کا تجزیہ اس طرح کرتے ہیں کہ وہ ان باتوں میں اپنے پیش رووں سے علیحدہ ہیں۔

یہ ٹھیک ہے مگر نا کافی ہے۔ یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ وہ کس حد تک اس سرمایے کے امین، اس روایت کے آئینہ دار، اور اس مزاج کے مظہر ہیں جو تہذیب و تمدن نے دیا ہے۔ وہ کس حد تک نئے اور کس حد تک پرانے ہیں اور یہی نہیں ان کے نئے پن میں کس حد تک پرانا پن ہے یعنی ان کی قدر و قیمت کا اندازہ محض ان کی جدت وندرت سے نہیں، ان کی ادبیت سے بھی کرنا چاہیے اور ادبیت سے یہاں مراد اس ادبی معیار سے ہے جو اس عرصہ میں بن سکا ہے۔ اقبال کی مثال سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔ اقبال کے "شمع و شاعر" میں یا "بال جبریل" کی غزلوں میں ہمیں نئے خیالات ملتے ہیں مگر یہ نئے خیالات اس شعریت کے ساتھ ملتے ہیں، جو مانوس ہے اور مقررہ سانچوں کے مطابق۔ یعنی اقبال جدید ہیں مگر ان کی جدت انہیں قدیم شعریت سے بے پروا نہیں کرتی، جس بادۂ و ساغر کے پردے میں مشاہدۂ حق بیان ہوتا تھا اسی کو مشاہدۂ حیات کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اقبال باوجود جدت کے، محض باغی نہیں ہیں، نہ حالی محض باغی ہیں۔ دونوں ایک نئی روایت قائم کرتے ہیں۔ مگر یہ روایت جبر سے زیادہ اختیار اور ترک سے زیادہ توسیع اور اضافے کی ہے۔ حالی اور اقبال بجنوری اور عظمت اللہ خاں سے اس لیے بلند ہیں کہ وہ اپنے دور کی آواز ہونے کے باوجود ماضی سے اتنے بیگانہ نہیں ہیں نہ اتنے انتہا پسند ہیں، نہ اس قدر Exclusive۔ کلیم الدین بہت سے نقادوں سے زیادہ نئی باتیں، سوچی ہوئی باتیں اور خیال آفریں باتیں کرتے ہیں مگر ان کی تنقید اور بلند ہوتی، اگر وہ اپنے قدیم سرمائے سے اس قدر بیزار نہ ہوتے اور ان کے یہاں تاریخ اور ادب کے تسلسل کا شعور اور زیادہ نمایاں ہوتا اور ان کی تنقید گلستاں میں کانٹوں کی تلاش نہ بن جاتی۔

حالی تک نے یہ تسلیم کیا ہے کہ شاعری کے لیے قافیہ وردیف ہی نہیں، وزن بھی غیر ضروری ہے

مگر ماضی کا احساس اور چیز ہے اور ماضی کا پابند ہونا اور چیز۔ اگر نقاد محض روایت کا احترام کرتا ہے محض لکیر کا فقیر ہے، محض بیسویں صدی کے ذہن کو سترھویں صدی کی طرف لے جانا چاہتا ہے تو وہ اپنے مقام سے گر جائے گا۔ ماضی کا احساس اور ماضی کے دھندلکے میں ایک ادبی تسلسل کا جلوہ بھی اسے تجربے، انوکھے پن، نئے پن اور اپج سے بے نیاز نہیں کر سکتا۔ آزاد شاعری کی ضرورت کیا ہے، نظم کافی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ خود نظم کی کیا ضرورت ہے۔ نثر میں کیا برائی ہے۔ آخر کمرے کی ترتیب کے لیے جب کوئی ایک طریقہ نہیں ہے جب حسن دائروں میں بھی ظاہر ہو سکتا ہے اور سیدھی لکیروں میں بھی، جب مصور کاغذ پر اپنا ذہنی عکس سیکڑوں طریقوں سے اتار سکتا ہے تو الفاظ کی ترتیب وموزونیت کا ایک ہی سانچہ کیوں ہو، کیوں ہر خیال کے لیے ضروری ہو کہ وہ قافیے کی تنگ نائے سے گزرنے کے لیے اپنے آپ کو سکیڑ سکے۔ کیوں ایک خیال تک پہنچنے کے لیے کئی مصرعوں کو عبور کرنا پڑے گا۔ حالی تک نے یہ تسلیم کیا ہے کہ شاعری کے لیے قافیہ وردیف ہی نہیں، وزن بھی غیر ضروری ہے اس لیے ہر تجربے پر اعتراض کہ وہ کیوں کیا گیا صحیح نہیں۔ تجربہ ظاہر کرتا ہے کہ مانوس سانچوں سے لوگ مطمئن نہیں، تجربہ حسن کو محدود نہیں رہنے دیتا۔ تجربہ نئے حسن کو آشکارا کر کے ذہن کو وسیع کرتا ہے ہر ادب میں تجربے ضروری ہیں۔ مگر تجربوں کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ صرف نئے فارم میں ظاہر ہو سکے۔ نئے موضوعات، نئے تصورات، نئے عنوانات میں بھی ظاہر ہونے چاہئیں۔ ہر اچھے نقاد کے لیے پرانے پن کی طرح اس نئے پن کا احترام بھی ضروری ہے۔ اس کی جاننے کی خواہش کو کبھی مردہ نہیں ہونا چاہیے۔ "مداوا" میں نئی شاعری پر تنقید کی گئی تھی۔ اس میں سب سے قابل اعتراض نئے پن سے اس قدر بیزاری تھی اور مانوس راہوں سے اس قدر اندھی محبت اور اس محبت کی سطحیت۔ نقاد اور پجاری دو الگ الگ مخلوق ہیں۔ نقاد پجاری نہیں ہوتا نہ وہ محتسب یا کوتوال ہوتا ہے۔ اس دور کی نظموں یا افسانوں پر یہ اعتراض کہ ان میں تلخی کیوں ہے۔ ان میں مسکراہٹ یا امید پروری کیوں نہیں۔ ان کے لکھنے والے جنسی بھوک کے کیوں شکار ہیں۔ یہ روتے کیوں ہیں؟ ہنستے کیوں نہیں؟ ان میں کلبیت کیوں پیدا ہوگئی ہے؟ ظاہر کرتا ہے کہ معترض اس دور کے مخصوص مسائل کو سمجھنے کی کوشش

نہیں کرتے۔ اس دور کی ایک خصوصیت میں ذرا تفصیل سے بیان کرنا چاہتا ہوں۔

پہلے جنگ اس طرح ہوتی تھی کہ پیشہ ور سپاہی لڑتے تھے، یا ان کے سردار، باہم زور آزمائی کرتے تھے۔ سردار کی شکست پر یا فوج کی ہار جیت پر لڑائی فیصل ہو جاتی تھی۔ سب لوگوں کا کام لڑنا نہ تھا، نہ سب کا حسن سے محظوظ ہونا۔ کچھ لوگ چاندنی، سبزے، حسن اور عورت سے لطف اٹھانے کے لیے پیدا ہوئے تھے، کچھ صرف ہل جوتنے، قرضہ ادا کرنے اور بھیڑ بکری کی طرح زندگی بسر کرنے کے لیے۔ اب صلح و جنگ کے پیمانے بدل گئے ہیں۔ لڑائی سب کی ہوتی ہے۔ صلح بھی سب کے لیے۔ چرچل انگلستان کا بچانے والا تھا مگر صلح ہوتے ہی عوام نے اسے دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیا۔ جنگ نے دکھا دیا ہے کہ ہر خواب کی تعبیر ممکن ہے، ہر جھونپڑا محل بن سکتا ہے۔ اس نے خوابوں کو رنگین اور ناکامیوں کو اور تلخ بنا دیا ہے۔ اس نے تعمیر و تخریب دونوں کے پیمانے بدل دیے ہیں۔ داغ حسرت دل کا شمار ہو گیا ہے اس کا اثر ادب پر پڑنا قدرتی ہے اور کوئی نقاد اس سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔

قدیم تنقید ہر شاعر کو علاحدہ علاحدہ دیکھتی تھی۔ یہ یاسیت کا امام ہے۔ یہ رجائیت کا پیغمبر۔ یہ صوفی ہے، یہ دنیادار۔ ذاتی حالات اور شخصی تجربات کا تذکرہ ہوتا تھا۔ شخصیت کا بھی احساس موجود تھا مگر ماحول کس حد تک تخلیقی کارناموں کو متاثر کرتا ہے، شخصیت میں کیسے چھپ چھپ کر ظاہر ہوتا ہے، کیسے کیسے عجیب و غریب راستوں سے فن میں راہ پاتا ہے، اس کی اسے خبر نہ تھی۔ جدید تنقید نے خارجیت، واقعیت، سماجی شعور، تمدنی تنقید جیسی اصطلاحوں تک رہنمائی کی ہے۔ اس نے جذبات کی پرچھائیوں کو فکر کی روشنی دی ہے۔ ادب کو اس روشنی کی ضرورت تھی۔ حالؔی کی شاعری کو غدر اور سرسید کی تحریک سے علاحدہ کر کے دیکھیے تو بے روح نظر آئے گی اور اس کی عظمت کا راز سمجھ میں نہ آ سکے گا۔ چکبستؔ اور اقبالؔ اور اقبالؔ اور موجودہ ترقی پسند شعرا میں اور پریم چند اور ان کے مقلدوں میں جو فرق ہے وہ ماحول کے احساس کے بغیر سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ تنقید کا کام اس کی وجہ سے اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ اسے فن کار کی شخصیت کو سمجھنا ہے۔ اس کے اپنے تجربات کا تجزیہ کرنا ہے۔ پھر اس کے عناصر کو ماحول کی روشنی میں دیکھنا ہے۔ تب جا کر صحیح ادبی بصیرت حاصل ہو سکتی ہے۔ اسی وقت فانیؔ کی قنوطیت اور جدید شعرا کی اداسی، مایوسی، تلخی، بیزاری، بلکہ موت کی آرزو سمجھ میں آ سکتی ہے۔

نقاد اپنے دور کو سمجھتا ہوا اور دوسرے دوروں سے واقف ہو تو بھی اس کے لیے ایک خطرہ باقی رہ جاتا ہے وہ آسانی سے فلسفے، سیاست یا تفسیر کی آغوش میں پہنچ سکتا ہے۔ آرنلڈ نے جب ادب کے لیے قدریں متعین کرنا چاہیں تو ان قدروں کو عام کرنے کے لیے اپنے دور کے گم کردہ راہ لوگوں کے خلاف بھی جہاد کرنا پڑا۔ وہ جہاد کامیاب ہوا یا نہیں، مگر آرنلڈ کے لکھنے سے ادب کی محرومی آشکار ہو گئی۔ یہ خطرہ صرف معلم اخلاق کو ہی نہیں۔ سیاست کے علم برداروں کو بھی ہے۔ تنقید کو سیاست کی غلامی نہیں کرنی چاہیے، سیاست کا ساتھ دینا چاہیے۔ اس کی رفاقت کرنی چاہیے۔ اس طرح تنقید نفسیات کی دلدل میں بھی گرفتار نہیں ہو سکتی۔ نفسیات کا علم ہمارے لیے بڑا مفید ہے مگر وہ پرفریب بھی ہے۔ وہ اس آئینے کی طرح ہے جو بڑی چیزوں کو چھوٹا اور چھوٹی چیزوں کو بڑا کر دیتا ہے۔ چہروں کو چپٹا اور لمبوترا بنا دیتا ہے۔ وہ رائی کو پہاڑ کر کے دکھاتا ہے وہ ایک گرہ کھولتا ہے، مگر سیکڑوں

جدید تنقید اور خارجیت، واقعیت، سماجی شعور، تمدنی تنقید جیسی اصطلاحوں تک رہنمائی کی ہے

ڈال دیتا ہے۔ نفسیاتی تنقید ہلدی کی گرہ لے کر پنساری بن بیٹھتی ہے۔ یہ سائنس ہونے کا دعویٰ کرتی ہے اور سائنس سے بعض حربے بھی مستعار لیتی ہے مگر ابھی سائنس نہیں بن سکتی۔ اسی لیے میں نفسیاتی شعور کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے موجودہ نفسیاتی تنقید کو گمراہ کن سمجھتا ہوں۔ ابھی تک نفسیات کے پیمانے سمندر کو کوزے میں بھرنے کی کوششیں ہیں۔

غزل نقاد محض فلسفی یا مبلغ یا ماہر نفسیات نہیں ہوتا، وہ صاحب نظر ہوتا ہے وہ بقول رچرڈس کے، ذہن کے ساتھ وہی عمل کرتا ہے جو ڈاکٹر جسم کے ساتھ۔ وہ قدروں کا خالق، برتنے والا اور پھیلانے والا ہے۔ قدروں کے خالق کی حیثیت سے وہ قدروں کے برتنے کے تماشے کو ذرا بلندی سے بھی دیکھ سکتا ہے اور برتنے والے کی حیثیت سے محض پھیلانے والے (یا مبلغ) سے اونچا مقام رکھتا ہے اس وجہ سے اس کی تبلیغ دوسرے کی تبلیغ سے بہتر ہوتی ہے اس میں زیادہ ابدیت ہوتی ہے۔

یہ واضح کرنے کے بعد کہ تنقید میں روایت اور بغاوت، ماضی و حال، ماحول اور انفرادیت، فن اور فلسفہ میں توازن قائم کرنا ہوتا ہے اتنا اور کہنا ضروری ہے کہ کچھ نقادوں نے اس توازن کو قربان کر کے بھی اہمیت حاصل کی ہے۔ شیفتہؔ اپنے دور کے بڑے اچھے نقاد تھے۔ وہ کلاسیکل ضبط و نظم کے قائل تھے اور ادب کو فن شریف سمجھتے تھے عوام سے انہیں سروکار نہ تھا۔ نظیر کو

نظر انداز کر کے انہوں نے اپنا نقصان کیا مگر ان کی اہمیت کا اعتراف بھی ضروری ہے۔ وہ حالی سے پہلے نقادوں میں سب سے اچھا تنقیدی شعور رکھتے تھے اور ان کا ''گلشن بے خار'' اپنے زمانے کا بہترین کارنامہ ہے۔ عظمت اللہ خاں نے نئے پن کے جوش میں یہاں تک کہہ دیا کہ ''غزل کی گردن بے تکلف ماردینی چاہیے۔'' اس وجہ سے ان کا درجہ زیادہ بلند نہ ہوسکا۔

مگر نئے راستے پر چلنے والوں میں پھر بھی ان کا بڑا درجہ ہے لیکن ان سے بڑا درجہ ان لوگوں کا ہے جنھوں نے اپنا توازن ذہنی قائم رکھا۔ جن کا ایک قدم یہاں ہے اور ایک وہاں، جو اپنے زمانے کے بھی اور ہر زمانے کے بھی ہیں۔ یعنی وہ آفاقی ذہن رکھتے ہیں۔

اب صرف سوال یہ رہ جاتا ہے کہ آیا تنقید کے لیے کوئی ایک جامع اصطلاح وضع کی جاسکتی ہے یا نہیں۔ میرے خیال میں اس کے لیے پرکھ کا لفظ سب سے زیادہ موزوں ہے، اس میں تعارف، ترجمانی اور فیصلہ، سب آجاتے ہیں۔ پرکھ کے لفظ کے ساتھ ہمارے ذہن میں ایک معیار یا کسوٹی آتی ہے۔ نقاد کے ذہن میں ایک ایسا معیار ضروری ہے۔ پرکھنے اور تولنے کے لیے ترجمانی اور تجزیہ ضروری ہے۔ مبصر یا پارکھ اپنا فیصلہ منوانے کے درپے نہیں رہتا اور تمام نقاد اس بات پر متفق ہیں کہ نقاد کو بھی آمر نہیں ہونا چاہیے۔ ایلیٹ کہتا ہے کہ

''اہم معاملات میں نقاد کو زبردستی نہیں کرنی چاہیے اور نہ اسے اچھے یا بُرے کا فیصلہ (جھٹ سے) صادر کرنا چاہیے، اُسے صرف وضاحت کرنی چاہیے اور پڑھنے والا خود ہی ایک صحیح نتیجے پر پہنچ جائے گا۔''

نقاد جب کسی تعارف کرتا ہے تو اس کا تعارف کسی نقیب کی پکار نہیں ہوتا ایک سیاح کی دریافت کرتا ہے۔ نقاد بھی اپنی دنیا کا کولمبس ہے۔ وہ پڑھنے والے کو ایک نئی فضا میں لے جاتا ہے، جس کا حسن اس نے دریافت کیا ہے۔ ہر تنقید ایک ذہنی سفر کا آغاز ہے۔ تعارف کو اعلان نہ ہونا چاہیے اور نہ ترجمانی کو فلسفہ۔

> اچھی تنقید میں جذبے کو ایک نازک پختہ اور مہذب احساس کا نکھار مل جاتا ہے۔ اسی لیے اچھی تنقید محض تخریبی نہیں ہوتی۔ محض خامیوں کو یا کوتاہیوں کو نہیں دیکھتی۔ وہ بلندیوں کو دیکھتی ہے۔

نقاد کو ترجمانی کے فرض سے اچھی طرح عہدہ برآ ہونے کے لیے خارجیت سیکھنی چاہیے۔ خارجیت کو بعض لوگ اخلاق کی بنیاد کہتے ہیں۔ اگر نقاد مصنف کو یہ موقع دیتا ہے کہ وہ اس کی آواز سے بولے اور اس کے قلم سے لکھے۔ اسے تھوڑی دیر کے لیے اپنے اندر سما جانے دے اور اس طرح اس کے ساتھ انصاف کرے تو وہ اچھا نقاد ہے۔ سائنس ہمیں ایک بڑی حد تک یہ خارجیت سکھاتی ہے اس لیے نقاد کو سائنٹفک اصولوں سے مدد لینی چاہیے۔ اس ترجمانی کے لیے بعض اوقات اپنے خلاف بھی بولنا پڑتا ہے اس میں ''ہونا چاہیے'' کو تھوڑی دیر کے لیے ''ہے'' کی خاطر پس پشت بھی ڈالنا پڑتا ہے۔ اس مرحلے سے گزرنے کے بعد نقاد کو حق حاصل ہے کہ وہ ''چاہیے'' پر بھی اصرار کرے۔ مثلاً عصمت چغتائی کے بہت سے افسانوں میں جنسی میلان ہی نہیں، جنسی کج روی بھی ہے۔ ان کے افسانے بقول فطرس کے، جسم کی پکار ہیں اور ان کا مرقع 'دوزخی' باوجود اپنی بے مثل حقیقت نگاری کے کچھ مریض (Morbid) سا ہے۔ مگر اس کے باوجود عصمت کی بے مثل حقیقت نگاری، اخلاقی کردار نگاری، فنی پختگی، زبان پر قدرت، اپنے ماحول سے واقفیت اور ادبیت میں کلام نہیں۔ ان کی اتنی خوبیوں کو تسلیم کرنے کے بعد ان پر اعتراض کرنے کا حق پہنچتا ہے۔ نقاد معلم اخلاق بھی ہوتا ہے مگر محض معلم اخلاق نہیں ہوتا۔ وہ جج بھی ہوتا ہے مگر محض جج نہیں۔ وہ مبصر یا پارکھ ہوتا ہے۔ تنقید میں بھی جوش اور جذبے کی ضرورت ہے مگر بُری تنقید محض جوشیلی یا جذباتی ہوتی ہے۔ اچھی تنقید میں جذبے کو ایک نازک پختہ اور مہذب احساس کا نکھار مل جاتا ہے۔ اسی لیے اچھی تنقید محض تخریبی نہیں ہوتی۔ محض خامیوں کو یا کوتاہیوں کو نہیں دیکھتی۔ وہ بلندیوں کو دیکھتی ہے اور یہ اندازہ لگاتی ہے کہ یہ بلندی کیسی ہے؟ حالی کے الفاظ میں وہ حیرت انگیز جلوؤں کا پتہ لگاتی ہے۔ وہ پستی کا احساس رکھتی ہے مگر پست نہیں ہوتی۔ وہ میر کے اشعار میں امرد پرستی کی طرف اشارے دیکھ کر میر کے مزاج اور تحت الشعور کی ادھیڑ بن میں کھو نہیں جاتی۔ شاعر کی بلندیوں پر نظر رکھتی ہے۔ اچھا نقاد پڑھنے والے کو شاعر سے شاعری کی طرف لے جاتا ہے۔ معمولی نقاد شاعر میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ اردو میں بھی اب تک خواص وعوام دوسرے کی رائے کے پابند ہوتے ہیں۔ وہ ہر فیصلے کو آنکھ بند کر کے قبول کرلیتے ہیں۔ اس میں ہیرو پرستی کے علاوہ ذہنی کاہلی بھی شامل ہے۔ اسی لیے تصویر کے دورُخ دیکھنے کی تکلیف نہیں گوارا کرتے۔ ایک رُخ، ایک فیصلہ، ایک فارمولا انھیں مطمئن کر دیتا ہے۔ وہ ہر چیز کو پرکھنے کی تکلیف نہیں گوارا کرتے۔ پارکھ بننے کے لیے بڑے نظم وضبط، بڑے ریاض اور رسا ذہن کی ضرورت ہے جبھی تو اردو تنقید میں مبلغ اور نقیب ہیں، پارکھ اور مبصر کم۔

ایک عہد کی موت

احمد جلیل/اوکاڑہ

دس جولائی 2006ء کا دن اہل ادب کے لئے ایک ایسی اندوہناک خبر لے کر آیا کہ جسے جھیلنے کی ہمتیں دم توڑ گئیں۔ احمد ندیم قاسمی کی موت کوئی عام سانحہ ارتحال نہ تھا۔ یہ ایک عہد کی موت تھی، ادب کے ایک پرشکوہ دور کا اختتام تھا۔ اس روز آسمان ادب رزق زمین بن گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے اردو ادب یتیم ہوگیا ہو۔

احمد ندیم قاسمی کی شخصیت ہمہ جہت تھی۔ اردو ادب میں انہوں نے جس صنف ادب میں بھی طبع آزمائی کی، وہ ایک معیار متعین ہوگیا۔ اردو افسانہ ہو یا غزل، کالم نگاری ہو کہ تنقید ان کی تخلیقات اپنی مثال آپ ہیں۔ وفات کے وقت ان کی عمر 90 سال تھی تقریباً 75 سال تک انہوں نے حرف کی حرمت کا پرچم بلند رکھا۔ معیار اور اصولوں پر انہوں نے کبھی سمجھوتہ نہ کیا۔ ان کی تخلیقات کی تعداد 50 کے قریب ہے۔ تقریباً چار نسلوں نے ان سے ادبی استفادہ کیا۔

انہوں نے ترقی پسند تحریک کے جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے اس تحریک کو بام عروج تک پہنچایا۔ کچھ لوگ ترقی پسندی کو لادینیت کے قریب لے جاتے ہیں جو درست نہیں۔ احمد ندیم قاسمی ترقی پسند ہونے کے ساتھ ساتھ سچے اور پکے مسلمان تھے۔ ان کی خوبصورت نعتیں میری اس بات پر دال ہیں۔ مزید براں بابائے اردو مولوی عبدالحق اور پیر حسام الدین راشدی جیسے جید مردان حق نے ترقی پسند تحریک کے جلسوں کی صدارت کی جو ان کی دینداری پر مہر تصدیق ثبت کرتی ہے۔

ان کی نظم اور غزل اعلیٰ معیار کے اعتبار کو چھوتی نظر آتی ہیں لیکن وہ غزل کو زندہ و جاوید صنف قرار دیتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ جب تک انسان باقی ہے غزل بھی باقی رہے گی۔ وہ مضافات میں ہونے والی تخلیقات کو بالخصوص استحسان کی نظر سے دیکھتے تھے۔ نئے لکھنے والوں کی بڑی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ انہیں ذاتی ستائش یا صلے کی پروا نہیں ہوتی تھی لیکن دوسروں کی دلجوئی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے تھے۔ باصلاحیت لکھاریوں کی تحسین غیر معمولی طور پر کیا کرتے تھے۔ اس حوالے سے میں مسعود احمد کا نام بطور خاص لوں گا۔ وہ ان سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ ان کے خطوط میں لپٹی محبتیں مسعود احمد کا قیمتی اثاثہ ہیں۔ وہ خط کا جواب ضرور دیتے تھے۔ جو لوگ انہیں ملنے جاتے ان پر محبتوں اور مروتوں کی انتہا کر دیتے تھے۔ اس حوالے سے میں بھی اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ ان سے آدھی ملاقاتوں اور پوری ملاقاتوں کے کچھ اثاثوں نے مجھے بھی ثروت مند کر رکھا ہے۔

قاسمی صاحب کی ادبی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ ان کے افسانے نے اردو ادب کو ایک معیار دیا۔ ان کا ''چوپال'' سے شروع ہونے والا یہ سفر ''نیلا پتھر'' تک ارتقائی منازل کی طرف رواں دواں نظر آتا ہے۔ کچھ لوگ اردو ادب میں افسانے کو روبہ زوال سمجھتے ہیں لیکن وہ اسے روبہ عروج سمجھتے تھے۔ تاہم وہ یہ بھی مانتے تھے کہ ہم انگریزی Essay کے معیار سے ابھی دور ہیں۔ انہیں یہ بھی خیال تھا کہ اردو میں عرصے سے اچھا ناول تحریر نہیں کیا جارہا۔

بظاہر ان کی ادبی مخالفتیں بھی ہوئیں لیکن دلی طور پر سب لوگ ان کا احترام کرتے تھے اور ان کی فنی عظمتوں کے قائل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غیر معمولی نماز جنازہ میں ڈاکٹر وزیر آغا بھی شریک ہوئے۔

ان کی وفات پر بے شمار ادبی تنظیموں نے تعزیتی ریفرنس کئے۔ ان کے سوگ میں برپا ہونے والی یہ تقریبات ان سے بے پناہ محبتوں کی آئینہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی عظمتوں کی بھی غماز ہیں۔ تقریباً تمام لکھاریوں نے انہیں بہترین لفظوں میں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ ان میں سے کچھ تاثرات اس طرح سے ہیں۔

☆ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ قاسمی صاحب کی ضرورت اور زیادہ محسوس ہوگی۔

(اعزاز احمد آذر)

☆ قاسمی صاحب ہمارے عہد کی بھرپور آواز تھے۔

(سعید احمد شیخ)

☆ قاسمی صاحب ایک پارس کی مثال تھے، جن کے پاس ہر جانے والا سونا بن جاتا تھا۔ (فرخندہ لودھی)

☆ قاسمی صاحب آنے والی نسلوں کے لئے مشعل ہیں۔ (خالد احمد)

☆ قاسمی صاحب کی وفات ایک ادارے کا خاتمہ ہے۔ (قیوم نظامی)

☆ قاسمی صاحب اللہ تعالیٰ کی نعمت تھے۔

(ڈاکٹر سلیم اختر)

یہ اور اس طرح کے بے شمار تاثرات احمد ندیم قاسمی کی عظمتوں کے آئینہ دار ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک بے مثال قلمکار اور ہمارے عہد کی چلتی پھرتی ادبی تاریخ تھے۔ ان کی ترقی پسندی اسلام اور وطن کے راستے میں کبھی آڑے نہ آئی۔ وہ Man of comitment تھے۔ بے شک قاسمی صاحب جسمانی طور پر ہم سے دور ہو گئے ہیں لیکن وہ ہمارے دلوں اور ذہنوں میں ہمیشہ آباد رہیں گے۔ ان کے افکار اور اشعار ہمیشہ زندہ و تابندہ رہیں گے۔ کیونکہ احمد ندیم قاسمی صرف ایک انسان کا نام نہیں ہے وہ ایک ادارہ تھے' قاسمی ایک عہد کا نام ہے۔ ادارے اور عہد کبھی مرا نہیں کرتے۔ اسی لئے شاید انہوں نے کہا تھا

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا

آخر میں ان کے کچھ خوبصورت اشعار آپ کی نذر ہیں۔

تمام عمر مرا دشت میرے ساتھ رہا
تمام عمر تمنا رہی کہ گھر جاتا

اک عمر کے بعد مسکرا کر
تو نے مجھے رلا دیا ہے

حالات کے قدموں پہ قلندر نہیں گرتا
ٹوٹے بھی ستارہ تو زمین پر نہیں گرتا

گرتے ہیں سمندر میں بڑے شوق سے دریا
لیکن کبھی دریا میں سمندر نہیں گرتا

سکول، کالج، یونیورسٹی کے طلبہ اور ریسرچ سکالرز کے لیے ہماری چند کتب

مضامین پطرس	پطرس	-/140 روپے
مضامین فرحت اللہ بیگ	مرتبہ: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	-/350 روپے
جاڑے کی چاندنی	غلام عباس	-/200 روپے
مراۃ العروس مع فرہنگ	ڈپٹی نذیر احمد	-/200 روپے
اُردو تحقیق صورت حال اور تقاضے	ڈاکٹر معین الدین عقیل	-/700 روپے
اُردو ادب کا ارتقاء	ڈاکٹر وحید قریشی	-/150 روپے
اُردو تنقید (انتخاب مضامین)	پروفیسر اشتیاق احمد	-/700 روپے
اُردو غزل (غزل کی دو سو سالہ تاریخ)	ڈاکٹر یوسف حسین خان	-/800 روپے
مقدمہ شعر و شاعری	الطاف حسین حالی	-/200 روپے
مقالات اقبال	عبدالواحد معینی	-/400 روپے
تنقیدات حسین فراقی	پروفیسر اشتیاق احمد	700 روپے
تنقید اور مجلسی تنقید	ڈاکٹر وزیر آغا	-/300 روپے
تحقیق شناسی	ڈاکٹر رفاقت علی شاہد	-/500 روپے
اصلاح تلفظ و املاء	طالب ہاشمی	-/250 روپے
اُردو کے 25 افسانے	ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر	-/500 روپے
نیا افسانہ اور قاری	ڈاکٹر طاہر تونسوی	-/250 روپے
ولی تحقیق و تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر محمد اشرف خان	-/250 روپے
فیض احمد فیض (تنقیدی مطالعہ)	ڈاکٹر طاہر تونسوی	-/400 روپے
داستان اقبال	آمنہ صدیقہ	-/200 روپے

ناشر: القمر انٹر پرائزز، غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور 042-37237500

مولانا حامد علی خاں کی یاد میں شاہد علی خاں کی زیر ادارت شائع ہونے والا مجلّہ

الحمراء

ادبی صحافت میں مقبولیت کے سنگ میل عبور کرتا ہوا گزشتہ پندرہ برس سے ہر ماہ باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے
اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے بک سٹال سے طلب فرمائیں یا ہم سے براہ راست منگوائیں

رابطہ کے لیے دفتر ماہنامہ الحمرا: j-24 ماڈل ٹاؤن، لاہور 0333-4001844

سیّد منظور الکونین......آخری کلاسیک نعت خواں

ارسلان احمد ارسل/لاہور

آہ کیسا مداح خوان مصطفیٰ ﷺ رخصت ہوا

بسا اوقات کسی محبوب کا داغ مفارقت عمر بھر کا روگ دے جاتا ہے۔ آپ چاہتے ہوئے بھی اس کے حصار سے باہر نہیں آسکتے۔ آپ کا دل نہیں مانتا کہ وہ شخص آپ کو چھوڑ گیا ہے۔ طبیعت ہے کہ سنبھلے نہیں سنبھلتی۔ جواس قائم نہیں رہتے، اشک نہیں تھمتے، اس وقت میری بھی یہی کیفیت ہے۔ کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ صاحبزادہ سید منظور الکونین صاحب کے ساتھ مرحوم کا لفظ بھی استعمال کرنا پڑے گا۔ ایسا شخص ہر قوم کو نصیب نہیں ہوتا۔ صدیوں ایڑیاں رگڑنی پڑتی ہیں تب جا کر چشمے پھوٹتے ہیں اور صحرا گلستان بنتے ہیں۔ میرا شاہ صاحب سے ربط تقریباً 25 برس پر محیط ہے۔ یعنی میری عمر تقریباً 4 برس تھی جب سے مجھے ان سے اپنی پہلی ملاقات یاد ہے۔ وہ ہمارے آبائی شہر ہارون آباد تشریف لایا کرتے تھے۔ جیسے ہی ہمارے گھر داخل ہوتے تھے دیکھتے ہی گود میں اٹھا لیتے اور پنجابی میں کہتے (اوہ میرا پتر آیا)۔

اک دن وہ مل گئے تھے سر راہ گزر کہیں
پھر دل نے بیٹھنے نہ دیا عمر بھر کہیں

میں ان کو اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے دیکھتا رہتا۔ میرے والد صاحب قبلہ پروفیسر محمد ریاض احمد شیخ سے شاہ صاحب کا گہرا ربط تھا۔ ان کی علمی، ادبی شعری اور فنی گفتگو گھنٹوں جاری رہتی اور میں ایک کونے میں بیٹھا سنتا رہتا۔ آہستہ آہستہ وقت گزرتا گیا اور 2001 میں ہم لاہور منتقل ہو گئے۔ شاہ صاحب کا ہمارے گھر آنا زیادہ ہو گیا اور میرا ربط شاہ صاحب سے زیادہ مستحکم ہوتا چلا گیا۔ میں نے انہیں صوم وصلوۃ کا پابند پایا۔ باوضو پایا۔ گریہ وزاری کرتے ہوئے پایا۔ 2002ء میں ہمارے گھر کی محفل میں امام نعت گویان عصر جناب حفیظ تائبؒ نے فرمایا تھا (سید منظور الکونین دور موجود میں ثناء خوانوں کے سردار ہیں)۔ میں سمجھتا ہوں جو مقام نعت گوئی میں جناب حفیظ تائب کو حاصل ہوا وہی مقام نعت خوانی میں اس دور میں جناب سید منظور الکونین کو حاصل ہوا۔ آیئے شاہ صاحب کے کوائف وفنی زندگی پر ایک نگاہ ڈالتے ہیں۔

صاحبزادہ سید منظور الکونین 15 جنوری 1944ء کو گجرات محلہ بیگم پورہ نئی آبادی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے جد امجد سید حفیظ اللہ حسینی، پردادا سید رحم شاہ، دادا سید محمد مسعود شاہ اور آپ کے والد صاحب کا نام سید محمد یعقوب تھا۔ آپ کا گھرانہ بہت علمی اور دیندار تھا۔ آپ کے دادا سید محمد مسعود نے پنجاب میں قاطع قادیانیت اور دافع مرزائیت کے نام سے شہرت پائی۔ آپ کے والد پنجاب کے علماء میں واحد ایسی شخصیت تھے کہ درس نظامی مکمل کر لینے کے ساتھ ساتھ انگریزی تعلیم بھی حاصل کی اور رائل آرڈیننس فیکٹریز میں چھوٹے ہتھیاروں کے ماہر انجینئر آفیسر کے طور پر چالیس سالہ خدمات انجام دیں۔ آپ کے چچا صاحبزادہ افتخار الحسن شاہ بھی پورے پاکستان میں افتخار ملت اور شہباز خطابت جیسے القابات سے جانے جاتے تھے۔

شاہ صاحب نے ایسے علمی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ شاہ صاحب کی ولادت اپنے ننھیال کے ہاں ہوئی وہاں آپ کا ابتدائی نام خالد محی الدین تجویز کیا گیا تھا لیکن سید نظام الدین راغب بارک پوری نے شاہ صاحب کو اپنی گود میں کھلایا اور نام پوچھنے پر جب شاہ صاحب نے خالد بتایا تو راغب کہنے لگے کہ حروف ابجد کے اعتبار سے اس بچے کا نام "م" سے شروع ہونا چاہیے چنانچہ انہوں نے شاہ صاحب کا تاریخی نام منظور الکونین رکھا۔ شاہ صاحب کی والدہ بہت نیک سیرت اور پاک طینت تھیں۔ شاہ صاحب کہتے تھے کہ میری والدہ کی بچپن کی سنائی ہوئی لوریوں نے مجھے نعت خوان بنایا۔

شاہ صاحب نے نعت خوانی کے میدان میں جب باقاعدہ قدم رکھا اس وقت سب سے بڑا نام جناب الحاج محمد اعظم چشتی صاحب کا تھا۔ اس وقت طول وعرض میں اعظم صاحب کا طوطی بول رہا تھا۔ اعظم صاحب پاکستان میں نعت خوانی کی کلاسیکی روایت کے موجد ہیں۔ اس کے علاوہ اس دور میں کچھ

> شاہ صاحب کہتے تھے کہ میری والدہ کی بچپن کی سنائی ہوئی لوریوں نے مجھے نعت خوان بنایا

اور اہم نام تھے جو اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ جگمگا رہے تھے مثلاً بابا محمد علی ملتانی، مستری محمد علی جالندھری، بابا صوفی محمد علی نقشبندی ٹرپئی والے وغیرہ وغیرہ۔

شاہ صاحب اعظم چشتی صاحب سے بہت متاثر تھے اور شروع شروع میں ان کے تتبع میں پڑھنا شروع کر دیا لیکن شاہ صاحب کے بزرگوں نے انہیں کہا بھئی تم جتنا مرضی اچھا پڑھ لو زیادہ سے زیادہ یہی کہ دیں گے کہ اعظم کی اچھی نقل اتارتا ہے منظور

الکونین کہاں جائے گا......؟ یہ بات ان کے دل میں گھر کر گئی اور شاہ صاحب منظور الکونین کی جستجو میں نکل پڑے۔ موسیقی کی تعلیم برصغیر کے نامور موسیقار استاد نیاز حسین شامی سے حاصل کی اور شعر و سخن کی تفہیم کے لیے جناب حافظ مظہر الدین مظہر کی صحبت اختیار کی اور اس صحبت نے ان کی زندگی کو اجلا کر دیا۔ حافظ صاحب کے کلام کو خواص و عوام میں مقبول کرنے کا سہرا بھی سید منظور الکونین کے سر ہے۔ میں نے زندگی میں حافظ صاحب کا سب سے پہلے نام شاہ صاحب کی زبان سے ہی سنا۔ شاہ صاحب کو حافظ صاحب سے عشق تھا۔ اللہ کے فضل سے جناب حافظ مظہر الدین مظہر کے کلیات کو مرتب کرنے کی سعادت بھی راقم کے حصے میں آئی پھر کیا ہوا کہ آہستہ آہستہ شاہ صاحب کی علیحدہ شناخت قائم ہوتی چلی گئی اور اعظم صاحب کے بعد شاہ صاحب کو بھی استاد کا درجہ حاصل ہوگیا۔ شاہ صاحب نے اعظم صاحب کے انداز کو جدید کر دیا اور اس طرح روایت میں جدت پیدا کر دی۔ جدت روایت سے ہٹ جانے کا نام نہیں ہے بلکہ روایت کو نئے اور سنجیدہ رویوں سے روشناس کروانے کا نام ہے یہی کام شاہ صاحب نے کیا جس کی بنیاد پر وہ قدیم و جدید کا سنگم ہوگئے۔ شاہ صاحب نے کبھی کلام کے معیار پر سمجھوتہ نہیں کیا۔ توقف اور تلفظ کے معاملے میں ان کا رویہ بہت غیر معمولی رہا۔ شاہ صاحب نے ان راگوں میں بھی طرزیں بنائیں جن میں ان سے پہلے کبھی نہیں بنیں تھیں۔ شاہ صاحب نے عمر بھر جہاد کیا کبھی نام نہاد اور بیہودہ قسم کی جدت کو اپنے قریب نہیں آنے دیا بلکہ بانگ دہل اس کی مخالفت کی اور ہمیشہ یہی کہا کہ جو نعت خوانی اب ہو رہی ہے اور جو کچھ محافل نعت میں ہو رہا ہے یہ اللہ اور اس کے رسول تک نہیں پہنچایا جا رہا۔ بلکہ بات ثواب کی بجائے عذاب میں نہ مبتلا ہو رہی ہو۔ جیسے نوٹ نچھاور ہو رہے ہوتے ہیں، جیسے بیہودہ گانوں کی طرزوں پر اشعار لکھوا کر پڑھے جا رہے ہوتے ہیں یہ کس کو خوش کر رہے ہیں، یہ کس کو دھوکہ دے رہے ہیں، صرف اپنے آپ کو۔ شاہ صاحب کی آواز میں جو

جدت روایت سے ہٹ جانے کا نام نہیں ہے بلکہ روایت کو نئے اور سنجیدہ رویوں سے روشناس کروانے کا نام ہے یہی کام شاہ صاحب نے کیا

مردانہ وجاہت تھی وہ تاریخ کے کسی دوسرے نعت خوان کی آواز میں نہیں۔ شاہ صاحب نے موسیقی کی تعلیم بھی ضرور حاصل کی اور ان سے زیادہ موسیقی پر دسترس شاید ہی تاریخ کے کسی دوسرے نعت خوان کو ہو لیکن اس کے باوجود کبھی ان کی نعت خوانی میں موسیقی نعت پر حاوی نظر نہیں آئی اور ایسا بھی محسوس نہیں ہوا کہ شاہ صاحب کوئی راگ گا رہے ہیں بلکہ انہوں نے موسیقی سے اتنا ہی استفادہ کیا کہ اپنی طرزیں خود بنا سکیں اور نعت خوبصورت طریقے سے بارگاہ رسول میں پیش کر سکیں۔ اور اب جو کچھ محافل نعت میں ہو رہا ہے استغفراللہ......

شاہ صاحب کی پیر سید نصیر الدین نصیر صاحب سے بڑی گہری دوستی تھی اور پیر صاحب محافل میں کہا کرتے تھے کہ "نعت پڑھنی اے تے کونین طرح پڑھو نئیں تے نہ پڑھو" 2011 میں مجھے شاہ صاحب کے فن اور شخصیت پر "حضور سرور" کے عنوان سے ایک کتاب ترتیب دینے کی سعادت حاصل ہوئی اس کتاب میں شاہ صاحب کی شخصیت کوائف سے لے کر ادباء، شعراء، علماء کے تاثرات و مضامین سے لیکر ان کی تصاویر، مختلف دیباچہ جات، یاداشتیں، شاعری اور پڑھی ہوئی نعتوں کا ایک انتخاب شائع کیا گیا ہے۔ یادوں کا اک ہجوم ہے۔ کس کس یاد سے گزروں...... اب ایسا نعت خوان پیدا نہیں ہوگا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کے مشن کو زیادہ سے زیادہ پھیلایا جائے مستقبل میں ساری ذمہ داری شاہ صاحب کے صاحبزادے سید سلمان کونین اور شاہ صاحب کے ہونہار شاگرد سید زبیب مسعود پر ہے کہ انہیں اس فن کو اگلی نسلوں تک منتقل کرنا ہے...... شاہ صاحب زندگی بھر سنجیدہ مدح سرائی کرتے رہے اور طویل علالت کے بعد 19 جولائی 2016ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے......

دار فانی چھوڑ کر دار بقاء رخصت ہوا
آہ کیسا مدح خوان مصطفیٰ ﷺ رخصت ہوا

شاہ صاحب کے جنازے پر عاشقوں کا اک سیلاب تھا، لوگوں کا ہجوم تھا جو ان کے دیدار کے لئے وہاں آیا تھا جگر گوشہ واصف علی واصف جناب کاشف صاحب کہنے لگے کہ واصف صاحب کہا کرتے تھے کہ ہم ساری زندگی اپنے جنازے کے لوگ اکٹھے کرتے رہتے ہیں اور شاہ صاحب کے جنازے پر لوگوں کے جم غفیر نے ثابت کر دیا کہ وہ کتنی کامیاب زندگی گزار کر گئے ہیں۔ کچھ دن پہلے راقم سے ایک شعر بے ساختہ ہوا لیکن مجھے لگتا ہے کہ شاہ صاحب کے جنازے کے لیے ہی نازل ہوا تھا

مرے جنازے پہ اک جشن کا سماں ہوگا
زمانہ آئے گا دیدار کے لیے میرے

اللہ پاک ان کو آقا کریم کا قرب عطا کریں آمین۔

مضمون

اکرم ناصر..... توانا لہجے کا شاعر

پروفیسر میاں محمد مرغوب

جناب اکرم ناصر کا مجموعہ کلام ''اجمال'' تلخیص کا کمال اور غزل کی جان ہے۔ کسی بزم مشاعرہ میں ان کا توانا لہجہ سننے والے کو خود متوجہ کرتا ہے۔ کسی مجلس میں ان کی موجودگی سے ماحول شگفتہ ہو جاتا ہے۔ ان کی گفتگو اور شعر تکلف سے پاک ہوتا ہے۔ ان کو غزل کے اسلوب' الفاظ' رموز و علائم اور مضامین پر مکمل دسترس ہے۔ وہ اپنے ماحول کے عکاس اور ترجمان ہیں۔ وہ ایک سچے' مخلص اور کھرے دانشور کی طرح اپنے عہد کے آشوب کی مکمل آگہی رکھتے ہیں۔ کلاسیکی شاعروں میں وہ میر تقی میر کے حُسنِ بیان اور پُر تاثیر لہجے سے متاثر ہیں۔ وہ اپنی غزل میں جدید رجحانات کا بھی خیال رکھتے ہیں۔

جناب اکرم ناصر کے مجموعہ کلام میں چھ نعتیں' دو نظمیں اور سو سے کچھ کم غزلیں شامل ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کے کلام میں غالب حصہ غزلوں کا ہے۔ ان کا شاعرانہ کمال غزل کی ہیئت میں اپنا رنگ دکھاتا ہے۔ ان کا پورا کلام سراپا انتخاب ہے۔ ان کے شہر غزل کے تمام راستے ہموار ہیں۔ گلیاں کشادہ اور روشن ہیں۔ تمام شہر کا نقشہ سوچا سمجھا ہے۔ اس شہر کی سیر کرنے والا اس کی عجائبات دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے۔ وہ ہر کوچے کو کوئے تمنا سمجھ کر بار بار اس کے چکر لگاتا ہے مگر جی نہیں بھرتا یہ حقیقت ہے کہ کلاسیکل غزل نے علامہ اقبال کے دور تک اپنے فنی تقاضے بھی پورے کئے اور اپنے عہد کی ترجمانی بھی کی۔ قیام پاکستان کے نصف صدی کے عرصے میں غزل میں کیا کچھ نہیں ہوا۔ اس نوزائیدہ مملکت جو مسائل ورثے میں ملے یا جو مسائل ہم نے خود پیدا کئے اور اپنے آشوب میں اضافہ کیا وہ تمامتر ہماری غزل کے پسندیدہ موضوعات رہے ہیں جناب اکرم ناصر نے ان کو بڑی مہارت اور چابکدستی سے اپنی غزل کی علامتوں میں استعمال کر کے اپنا فرضِ منصبی ادا کیا ہے۔ ان مسائل پر ان کی گرفت ملاحظہ فرمائیں۔

ہمارے شہر میں پستہ قدوں کی حکمرانی ہے
جوان کے سر سے اونچا ہو وہ سر باقی نہیں رہتا

....

اب نئے انداز سے ہوگی سحر تہذیب کی
سیکھتے جاتے ہیں بچے پگڑیوں سے کھیلنا

....

سج گئے چہرے نمائش گاہ میں
حُسن یوں پہلے کبھی رسوا نہ تھا

....

نہ جانے کس لئے چیخی تھیں چڑیاں
تناور پیڑ جب گرنے لگا تھا

....

اچانک یوں ہوا قبریں کھلیں اور سر نکل آئے
جونہی منزل پہ ہم پہنچے کئی رہبر نکل آئے

....

سو جاؤ مرے بچو' تم آرام سے اس پر
اب صبح سے پہلے نہ یہ فٹ پاتھ چلے گا

غزل کے مزاج داں جانتے ہیں کہ ہر کامیاب شاعر قافیے اور ردیف پر حاکمانہ قدرت رکھتا ہے اور جو لوگ ایسا نہیں کر سکتے وہ یہ نعرہ لگاتے ہیں کہ قافیے اور ردیف کی پابندی سے ایک عمدہ مضمون کا خون ہو جاتا ہے۔ اس لئے غزل غیر مقفّٰی ہونی چاہئے تاہم ایسے شاعر بھی ہیں کہ جنہوں نے اس کی پابندی کی ہے لیکن ایک اڑیل گھوڑے کی طرح ان ہر دو پابندیوں قافیے اور ردیف نے ان باغیوں کا حکم نہیں مانا اور مفہوم کو منزل تک نہیں پہنچایا۔ جناب اکرم ناصر کے قافیے اور ردیف ان کی چابکدستی سے ہموار زمین پر چلتے ہیں شعر میں موسیقی پیدا کرتے ہیں اور بیان کردہ حقائق کو تسلیم کراتے ہیں۔ ان کے پورے کلام میں ان کی یہ خصوصیت قاری کو آواز دے کر اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ ذرا دیکھئے ان اشعار میں قافیہ اور ردیف کس طرح خیال سے ہم آہنگ ہیں۔

ہوئی جس روز سے ہیں چار آنکھیں
عجب لذت سے ہیں سرشار آنکھیں
یہ سونا گھر کسی کا منتظر ہے
بنے ہیں سب در و دیوار آنکھیں
لگے جس روز سے ہونٹوں پہ پہرے
بنی اس روز سے اظہار آنکھیں

ایک اور غزل میں قافیہ اور ردیف کی شیرازہ

بندی قابل داد ہے۔

ظاہر میں بات ہے اور مگر لفظ اور اشارا کرتے ہیں
ہے جیت حقیقت میں ان کی جو کھیل میں ہارا کرتے ہیں

تخریب کی لذت نے ہم کو تسخیر کیا ہے کچھ ایسے
جب ریت گھروندے بن جائیں لہروں کو پکارا کرتے ہیں

ایک مشہور محقق، دانشور اور نقاد ڈاکٹر عبداللہ فرماتے ہیں کہ آج تک یہ پتہ نہ چل سکا کہ غزل ''اخفا'' کا نام ہے یا ''اظہار'' کا۔ اس مختصر قول میں بہت بڑی حقیقت بیان کر دی گئی ہے۔ ظاہر ہے غزل میں بہت سے معاملات پردہ داری میں یوں بیان کر دیئے جاتے ہیں کہ بظاہر وہ ''اخفا'' ہوتا ہے لیکن دراصل وہ اظہار ہوتا ہے۔ ہر اچھا شاعر بات کو چھپاتا بھی ہے اور ظاہر بھی کرتا ہے۔ اس لحاظ سے کوئی دوسری صنف اردو غزل کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ جناب اکرم ناصر کا کلام پختگی فکر کی بہترین مثال ہے الفاظ اور خیالات ان کی انگلی پکڑ کر چلتے ہیں۔ اخفا میں اظہار کی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ان کے کلام میں حقیقت اور سچائی میں کوئی بعد نہیں۔ ہمیں حالات نے جس کیفیت سے دو چار کر دیا ہے اس نے ہمیں کیا کیا کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ جناب اکرم ناصر نے اس صورت حال کو اپنی عینک سے یوں دیکھا ہے۔

مرا بیٹا تقاضے جانتا ہے عہدِ حاضر کے
کھلونوں کی دکاں سے بھی کلاشنکوف لائے گا

انہیں اب فکر ہے چوپال کے سنسان ہونے کی
جو کہتے تھے یہاں بوڑھا شجر اچھا نہیں لگتا

....

حیات کنگال کر گئی ہے گھروں میں فاقے پڑے ہوئے ہیں
مگر وہ چسکا کہ نام لکھنا تو ساتھ عزت مآب لکھنا

....

جو ہوا سو ہوا، جو ملا سو ملا، جو گیا سو گیا
فیصلہ جو کیا، ہم بدلتے نہیں، ذائقوں کی طرح

اب جناب اکرم ناصر کی ایک اور خصوصیت کا ذکر ضروری ہے۔ ان کے کلام میں بادل، برسات اور بارش کا استعارہ ایک رشتہ معنوی کی طرح موجود رہتا ہے اور وہ شاعر ہونے کی بناء پر اس سے بے تعلق نہیں رہ سکتے۔ زمین جب مردہ ہوتی ہے ویرانی کا منظر پیش کرتی ہے۔ طبیعت اس کو دیکھ کر افسردہ ہوتی ہے۔ جب بارش ہوتی ہے تو جو کچھ اس کے سینے میں ہوتا ہے ظاہر ہو جاتا ہے۔ ہر طرف بہار آ جاتی ہے۔ جنگل میں منگل ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے اس کی کثرت سے کچے گھروں کے در و دیوار بیٹھ جاتے ہیں۔ راستہ چلنے والوں کو احتیاط کرنی پڑتی ہے۔ پانی کے سیلاب سے جھونپڑی کی تو کیا حقیقت ہے پختہ مکان بھی اس میں بہہ جاتے ہیں۔ جب بادل نہیں برستے تو خواہش ہوتی ہے کہ یہ ٹوٹ کر کیوں نہیں برستے۔ بادل، برسات اور بارش کے الفاظ جناب اکرم ناصر کے کلام میں کیا سماں باندھتے ہیں۔ دیکھئے اور لطف اٹھایئے۔

بچ کے رہنا راہ کے کچے در و دیوار سے
بارشوں کو آ گیا کچے گھروں سے کھیلنا

خشک سالی میری ساری کھیتیوں کو کھا گئی
اور بارش لے گئی گھر کے در و دیوار بھی

....

سرکنڈے کی چھت ہے جن کی، ٹین کے ہیں پرنالے
شہر میں کچے گھر بھی ہیں کچھ دیکھ برسنے والے

....

مری تو جھونپڑی تھی، جھونپڑی میں دم ہی کتنا تھا
گرے پختہ مکاں، اب کے برس سیلاب تھا ایسا

....

سارے موسم بیت گئے ہیں
بادل ٹوٹ کے کب برسے ہیں

....

اس کو چھوڑو وہ برسے یا بن برسے ہی لوٹ گئے
اتنا اثر دعا میں کم ہے بادل جھوم کے آئے بہت

اس کو ایسے نہ ہار کر دیکھو
زندگی ہے گزار کر دیکھو

وہ تمہارا ہے لوٹ آئے گا
تم کسی دن پکار کر دیکھو

میری سانسوں میں جی رہے ہو تم
روپ کوئی بھی دھار کر دیکھو

کھل ہی جائیں گے راز ہستی کے
عشق دریا بھی پار کر دیکھو

آنکھ ساگر میں دل کشی ہے بہت
نقش کوئی ابھار کر دیکھو

چاند کتنا حسین ہے گوہر
رخ سے آنچل اتار کر دیکھو

انمول گوہر/لاہور

"تروینی تیرے نام"......ایک تخلیقی شاہکار

خورشید بیگ میلسوی/میلسی

زعیم رشید شاعری میں ہیئت کی نئی صنف کے ساتھ ادب کے افق پر جلوہ گر ہوئے ہیں جس پر ہر جانب سے ان کو داد و تحسین مل رہی ہے اس کی وجہ زعیم رشید کا اپنے ذاتی کردار کی وجاہت اور سیرت کی خوش قامتی کے علاوہ تروینی پر ان کا ریشم بننے جیسا کام ہے جس کے لیے انہوں نے دن رات ایک کر کے ایک خوبصورت کلام مرتب کر کے ہمارے خطے سے ایک کنٹروبیوشن دے کر جو حاصل کیا اس کا انہیں احساس ہو رہا ہے جو آئندہ حاصل کریں گے وہ برصغیر کے عظیم شاعر گلزار کی زبانی سنیے جو رقم طراز ہیں:

"تروینی کا یہ پودا لگا کر اب بڑی تسلی ہوتی ہے یہ پھل پھول رہی ہے اور مجھ سے بھی اچھے باغبان ملے ہیں اسے زعیم رشید کی خوبصورت تروینیاں پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی ہے زعیم نے یہ بیل اوپر کی منڈیر تک پہنچا دی ایک خوبصورت رنگ دیا ہے"، "زعیم کی تروینیاں اردو کے ہر شہر ہر ملک تک جائیں گے ان کے خوابوں کی تعبیر ہو گی ان کا ذکر ہمیشہ رہے گا"

اردو ادب میں صنفی تجربات مسلسل ہو رہے ہیں جس طرح افسانچے کو مائکروفکشن کے روپ میں پیش کیا گیا ہے اس طرح نظم بھی اب تروینی کی شکل میں آ چکی ہے گلزار صاحب نے اس کی بنیاد رکھی اور پھر شاعروں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا یقیناً دیگر اصناف کی اپنی اہمیت ہے لیکن کسی زبان کا ادب تب توسیع پذیر ہوتا ہے جب کھلے دل سے اس میں نئے تجربات تسلیم کیے جائیں ویسے بھی یہ کوئی نثری نظم نہیں بلکہ اس میں ایک رواں بحر موجود ہوتی ہے جو شاعری کے لیے اکثر نقادان سخن ضروری سمجھتے ہیں س لیے یہ ایک صنف نظم ہے اور اس کا رو کا نہیں جا سکتا اس پر محنت فرض ہے جو شعرائے کرام کو کرنی چاہیے زعیم رشید جیسے نوجوان شاعر نے یہ دودھ کی نہر نکالی ہے جس پر میں انہیں پہلے مرحلے پر دل کی گہرائیوں سے مبارکباد دیتا ہوں کیونکہ میں تروینی کا مستقبل اس خطے کے علاوہ پورے برصغیر میں شاندار دیکھ رہا ہوں تروینی ایک رواں بحر میں تین مصرعوں کی تشکیل سے صورت پذیر ہوتی ہے یہ مصرعے ہم ردیف یا ہم قافیہ ہونا ضروری نہیں تیسرا مصرع ٹیپ کا مصرع ہوتا ہے اسے مزید سمجھنے کے لیے تین تروینیاں دیکھیے یہ وہ تروینیاں ہیں جو جناب گلزار صاحب نے اس مجموعہ کلام سے منتخب کی ہیں میں انہیں قارئین کے ساتھ شیئر کرنا چاہتا ہوں:

1۔ایک اگن کے دوار کئی اشکوں کے دیپ جلائے
گنگا کے پانی سے میرا سا بدن جل جائے
ایک سندری کا سپنا جب نینن میں لہرائے

2۔ پہلے پہل تو شہر کی جانب دوڑ کے جایا کرتی تھی
جانے کیسا چندرا ظلم کمایا رنڈ وے شہروں نے
گاؤں کی بیوہ پگڈنڈی بھی شہر کے نام سے ڈرتی ہے

3۔آج تروینیوں کی بستی میں
کوئی میرے لیے اداس رہا
آج میں ساری رات سو نہ سکا

بوریوالہ سے تعلق رکھنے والے ہمارے شاعر زعیم رشید شروع ہی سے اپنی والدہ ماجدہ محترمہ شمشاد رشید کے بیان کے مطابق تقاریری مقابلوں میں اول آنے کے علمی فکری اور دانشورانہ مشغلہ رکھتے تھے پھر یہ ننھا دانشور علم کی سیڑھیاں طے کرتا ہوا پنجاب یونیورسٹی لاہور جیسے تعلیمی ادارے میں پہنچا جہاں سے زعیم رشید نے ایم ایس (کمیونیکیشن اسٹڈیز) کے دوران بھی گورنر سے اول انعام حاصل کیا الیکٹرونک میڈیا سے سپیشلائزیشن کی پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن کی یونیورسٹی گیا اس نے انگریزی میں لکھنا شروع کیا اس کی نظموں کا انگریزی زبان میں بھی ترجمہ ہوا ایک صدا کی دوری میں اس نوجوان شاعر نے اس عہد کے تین اہم شعراء جناب گلزار، جناب بشیر بدر، جناب جاوید اختر کا منتخب کلام مرتب کیا جس کے بعد انہوں نے میر حسن کی غزلیات اور شخصیت پر کتاب دی ان کی انگریزی نظموں کی کتاب In Quest of Love کے نام سے چھپی اب یہ چوتھی کتاب میرے سامنے ہے 128 صفحات پر مشتمل یہ خوبصورت کتاب دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ سجی ہوئی ہے جبکہ خوبصورت طباعت کی وجہ

سے یہ لائبریریوں کی ظاہری شان و شوکت بڑھانے والی کتاب ہے اور جب اس کے اندر جھانکتے ہیں تو یقیناً چاہِ یوسف کی قربتوں کا احساس ہوتا ہے انہوں نے یہ کتاب اپنی پہلی محبت، دوسری جدائی اور تیسری محبوبہ کے نام کی ہے ظاہر ہے یہ انتخاب بھی ایک تروینی ہے اپنے عہد کے شاعر خالد احمد کا نام انہوں نے ایک تروینی میں یوں استعمال کیا ہے کہ خالد احمد کا پیکر لاہور کی سڑکوں پر سگریٹ کے دھوؤں کے مرغولے اڑاتا نظر آتا ہے اور تروینی سے ان کی محبت کا لطف اس مزے کو دوآتشہ کر دیتا ہے تروینی دیکھیے:

مجھ پہ در زندگی کے کھلنے لگے
خالد احمد کے ایک مصرع کو
گنگنانے لگا میں آخر شب

ان کے عمومی موضوعات محبت، آرزو، مزاج کے فلسفیانہ نکتے، تخلیق کی نت نئی مرصع کاریاں، خود کلامی، شہری اور دیہاتی زندگی، داخلی و خارجی حسیت، روایت اور جدت کی آمیزش، گاؤں اور میلوں ٹھیلوں کے مناظر، جنگلوں کی تنہائی، اقدار کی ترجمانی، وصل و ہجر، موسموں کی کہانی وغیرہ ہے جو ہمیں ان کی تروینیوں میں جگہ جگہ دلکشی کے ساتھ نمایاں نظر آتے ہیں انہوں نے ہر موضوع پر لکھتے ہوئے اس کے اندر اپنی انفرادیت کو اجاگر کیا ہے جسے ہم ان کا اسلوب کہہ سکتے ہیں جو دیگر تروینی لکھنے والوں سے انتہائی مختلف ہے مثلاً یہ تروینی دیکھیے:

چاند پلٹ کر آجاتا ہے سورج بھی آجائے گا
مجھ کو چھوڑ کر جانے والے تجھ کو اتنا دھیان رہے
پیچھے مڑ کر دیکھنے والا پتھر کا ہو جاتا ہے

انہوں نے لفظیات کے کمالات سے بھی تروینی کے حسن کو دوچند کیا ہے موضوعات کی بوقلمونی کے ساتھ ساتھ لفظیات میں چناؤ اور احتیاط کے ساتھ ساتھ ریاضت نے ان کی تروینی کو مرصع کاری کا حسن دیا ہے میں اس تروینی پر اپنے مضمون کو تمام کرتا ہوں۔

بھور سمے گھر لوٹے سپنے لیے اندھیری رات
نینوں میں بے درد برستی یادوں کی برسات
دل پگلے نے تیرے غم کا کبھی نہ چھوڑا ساتھ

میرا حوالہ میری نسبت پاکستان
میرا گھر اور میری جنت پاکستان
اس کے ہوتے میں مایوس نہیں ہوتی
میری ہے اُمید اور ہمت پاکستان
اس کے ہونے سے ہے میرا سر اُونچا
میری شان اور میری شوکت پاکستان
اس جذبے سے بڑھ کے نہیں کوئی جذبہ
میرا دل اور میری محبت پاکستان
سبز ہلالی پرچم میرا آئینہ
میری تو ہے شکل و صورت پاکستان
اس سے ہے پہچان مری ملکوں ملکوں
دنیا بھر میں میری عزت پاکستان
جانوں کا نذرانہ دیں گے ہم لبنیٰ
چاہے جتنی مانگے قیمت پاکستان

لبنیٰ صفدر/ پنڈی بھٹیاں

جو باتیں ہیں مرے اندر بیان کر جاؤں
کوئی بھی خوف نہیں چاہے پھر میں مر جاؤں

مجھے تو اپنے ہی لہجے سے خوف آتا ہے
کہ جتنا سچا ہوں میں زہر سے نہ بھر جاؤں

وہ بے بسی ہے کہ چہرے پہ ساتھ دِکھتی ہے
وہ شرم ہے کہ میں اب خود میں ہی اُتر جاؤں

کبھی تو میرے لیے منتظر ہوں گھر والے
میں چاہتا ہوں کبھی میں بھی اپنے گھر جاؤں

میں زندگی میں کچھ اس کے لیے نہیں کر پایا
سو جان دے کے اب احسان اُس پہ دھر جاؤں

یہ لوگ کس لیے کوئی بھی میری بات سنیں
میں بے اثر ہی تھا آیا سو بے اثر جاؤں

میرا یہ حال ہے میں خود سے دور بھاگتا ہوں
اُسے قبول تو کیا خود سے بھی مکر جاؤں

وہ میری راہ میں بیٹھا ہے کب میں آؤں گا
میں سوچتا ہوں کہ میں پاس سے گزر جاؤں

وقارؔ جس نے مجھے بولنے کی قوت دی
تو کیا وہ چاہے گا اب لوگوں سے میں ڈر جاؤں

ڈاکٹر وقار خان/ ملتان

تنہا رہنا سیکھ لیا ہے......ایک جائزہ

سرور ارمان/ لاہور

سلیقہ مند شاعر جعفر حسن مبارک کا مجموعۂ غزل (مطبوعہ ۲۰۱۱ء) ''تنہا رہنا سیکھ لیا ہے'' زیر نظر ہے۔
جعفر حسن مبارک اس حقیقت کا ادراک رکھتے ہیں کہ جمالیاتی اقدار کو کماحقہٗ شاعری کی بناو بنائے بغیر اعلیٰ شاعری منصۂ شہود پر نہیں لائی جا سکتی۔ غزل معیار کی بلندیوں سے اسی صورت میں ہمکنار ہوتی ہے کہ جب کلاسیکی شعری روایت کی پاسداری کی جائے اور زبان و بیان کی باریکیوں کو ملحوظ خاطر رکھا جائے۔

جعفر حسن مبارک کے پاس مضامین کی کمی بھی نہیں اور انہیں اظہار پر بھرپور دسترس بھی ہے۔ لیکن یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ وہ اپنی غزل کو رومانیت سے آراستہ تو کرتے ہیں مگر اسلوب کے معاملے میں بے حد محتاط ہیں۔ ان کی غزلوں کا مطالعہ کرتے ہوئے کہیں یہ گماں نہیں گزرتا کہ وہ مضمون کے ساتھ ساتھ انداز اور زبان بھی مستعار لینے کی کوشش میں ہیں۔ اور بلاشبہ یہ جعفر حسن مبارک کا امتیاز ہے۔

وصالِ یار تیرے بعد مجھ کو
بتا ایسی اذیت کون دے گا

بھول جانا اسے آتا ہے مجھے
اور میں ایسا نہیں کر سکتا

لوگ کہتے ہیں لاجواب مجھے
جب اسے لاجواب لکھتا ہوں

جعفر حسن مبارک کی غزل اس خوبی کی حامل بھی ہے کہ وہ بلاضرورت اور بے محل علامتوں، استعاروں اور ابلاغ کی راہ میں حائل پیچیدگیوں میں بالارادہ نہیں الجھتے۔ وہ ہنرمندی اور خوش سلیقگی پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی شاعری میں کسی قسم کی ڈرامائی اور چونکا دینے والی فضا بھی پیدا نہیں کرتے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ان کے شعر دلآویزی اور اثر پذیری کے حسن سے مالا مال ہیں۔ ان کے اشعار کا مطالعہ قاری کو خوابوں خیالوں کے بعید از قیاس جہانوں میں نہیں لے جاتا بلکہ زندگی کے حقائق اور اس کے تقاضوں سے ہم آہنگ رکھتا ہے۔

کیا ہے مجال کوئی نظر اس پہ رک سکے
وہ حسنِ انتخاب سے آگے کی چیز ہے

کم ہوگیا ہے ملنے ملانے کا سلسلہ
لگتا ہے دوستوں کی ضرورت بدل گئی

اے مرے دوست تجھے شدت سے
یاد آ جانے کی عادت کیوں ہے

جعفر حسن مبارک کی حقیقت پسندی اور زیب داستاں کے معائب سے گریز انہیں ترقی پسند فکر و نظر کا حامل ثابت کرتا ہے۔ وہ جس معاشرہ میں اور جن حالات میں زندہ ہیں ان کی تصویر کشی کے بغیر اپنی شاعری کو نامکمل سمجھتے ہیں وہ سماج میں پھیلی ہوئی بدصورتیوں، بے انصافیوں اور ناہمواریوں کو قبول نہیں کرتے انہیں اپنی شاعری میں جگہ بھی دیتے ہیں اور وہ بھی محض ہمدردانہ اور ترس کھانے والے انداز میں نہیں بلکہ یہاں ان کا نرم و مائل لہجہ جرات مندانہ احتجاج کا روپ دھار لیتا ہے۔ اور وہ لاکھوں کروڑوں مظلوم لوگوں کی ترجمانی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن وہ مقصدیت اور شعریت کو ایک ساتھ لے کر چلتے ہیں اور یہ کارِ سہل نہیں۔ جعفر حسن مبارک کی ایک قابلِ ذکر خوبی یہ بھی ہے کہ وہ گردشِ دوراں سے خائف اور تھک کر بیٹھ جانے والوں میں سے نہیں۔ ان کا مزاج اور طرزِ عمل رجائیت پسند ہے۔

دیکھ کر بہتا لہو روز سوال اٹھتا ہے
امن کی نیک دعاؤں کا صلہ کیا نکلا

پشت پر وار دھوکے سے اس نے کیا
جو یہ کہتا تھا للکارنا شرط ہے

بارش سی ایک خون کی جاری ہے ان دنوں
ہے یہ بہار یا کہ خزاں کچھ خبر نہیں

سچ تو یہ ہے کہ اپنی غزلوں میں
روز و شب کا حساب لکھتا ہوں

اپنے جلو میں لے کر چلتے ہیں سورج
ظلمت کو تنویر بنا کر چلتے ہیں

جعفر حسن مبارک رشتوں کے تقدس اور عظمت کی خو رکھنے والے پاکیزہ فطرت شاعر ہیں۔ ان کی رومانیت اور ترقی پسندی و جدت طرازی انہیں اس احساس سے گریزاں نہیں کرتی۔

رحمت کی آنے والی گھٹاؤں کے سلسلے
چاروں طرف ہیں میرے دعاؤں کے سلسلے
رکھتی ہے مجھ کو شفقتِ مادر امان میں
رہتے ہیں دور مجھ سے بلاؤں کے سلسلے

جعفر حسن مبارک کی غزل اردو شاعری کے درجہ اعتبار پر فائز ہے۔ ان کے ہاں حقیقت پسندی بھی ہے اور عمیق نگاہی بھی۔ وہ تجربے اور مشاہدے کو ہمراہ لے کے چلتے ہیں۔ یہ محاسن ان کی غزل میں وسعت پذیری اور ہمہ گیریت کے ذمہ دار ہیں۔ یقیناً ان کی غزل اردو شاعری کا سرمایۂ افتخار ہے

کچھ نیلما ناہید درانی اور ان کی شاعری کے بارے میں

سمندر منصوری/لاہور

1: FATIMA JINNAH GOLD MEDAL 2004 FOR EXCELLENCE IN LITERATURE BY GOVERNOR OF PUNJAB PAKISTAN

2: GOLD MEDAL FOR MAGNIFICENT SERVICES IN POLICE DEPARTMENT AND LITERATURE 2005 BY THE PRIME MINISTER OF PAKISTAN

3: FIRST PRIZE FOR A POEM IN A POETRY COMPETITION BY UNITED NATIONS (UNAMID) IN DARFUR SUDAN ON WORLD HIV AND AIDS DAY 1 DECEMBER 2010

FIRST WOMAN SENIOR SUPERINTENDENT OF POLICE OF PAKISTAN

RADIO DJ

TV ANCHOR

A SONG AND GHAZAL WRITER AND A COMPOSER

SERVED FOR UNO IN KOSOVO BOSNIA AND SUDAN

AUTHOR OF 14 BOOKS IN FOUR LANGUAGES (URDU PUNJABI ENGLISH AND PERSIAN):

1: jab tak ankhien zinda hain (urdu poetry)

2: jab nehr kinare sham dhali (urdu poetry)

3: tumhara shehr kesa hai (urdu poetry)

4: wapsi ka safar (urdu poetry)

5: chanan kithey ho ya (punjabi poetry)

6: dukh sabha aye jag (punjabi poetry)

7: chand chandni chandigarh (travelogue of india)

8: chardey suraj di dharti (travelogue of japan)

9: neelma ki ghazalien (urdu poetry)

10: udas logon se pyar kerna (urdu poetry)

11: rastey main ghulab rukhien hain (urdu poetry)

12: aqeedat (urdu poetry)

13: qatra qatra ishq (urdu and english poems)

14: thandi aurat (short stories)

COLUMNS:

1: attish e khamosh (daily akhbar e lahore)

2: attish e khamosh (daily lashkar)

3: behr e mulaqat (daily nawayewaqt)

4: behr e mulaqat (daily pakistan)

5: neina de akhey (daily khabran)

RADIO:

1: ghazal time (FM 101)

2: rangla punjab (FM 95)

TV:

ANNOUNCER (PAKISTAN TELEVISION LAHORE)

ANCHOR PERSON: (SITARON KE SATH) (ROYAL TELEVISION)

SONGS AND GHAZALS:

UDAS LOGON SE PYAR KERNA KOI TO SEEKHEY A RECORD BREAKING GHAZAL OF 1990-2000

یہ تو ہوا نیلما کا ایک عمومی تعارف اب آیئے جانتے ہیں کہ میرا اور نیلما کا تعارف کیسے ہوا اور پھر یہ کس تعلق میں اور کیسے تبدیل ہوا۔ دسمبر ۱۹۹۸ میں، میں اپنی پہلی کتاب (اِک ترے انتظار کا موسم) کے ساتھ ادبی حلقوں میں متعارف ہوا۔ اِسی زمانے میں استاد حامد علی خان کی گائی ہوئی غزل اُداس لوگوں سے پیار کرنے کوئی تو سیکھے۔ شعروشاعری اور موسیقی سے دل چسپی رکھنے والے لوگوں کی تقریباً ہر محفل میں زیرِ بحث تھی۔ سُننے میں آیا کہ کسی نیلما نامی خاتون شاعرہ کی غزل ہے پھر یہ بھی سُنا کہ جتنا یہ سخن پیارا ہے سخنور اِس سے بھی زیادہ خوبصورت ہے مگر ساتھ ہی یہ وارننگ بھی ملی کہ سخن ور پہ ڈورے ہرگز نا ڈالے جائیں کیونکہ اِس کلام کی مالکن صاحبِ کردار ہونے کے ساتھ ساتھ پولیس کی اعلیٰ افسر بھی ہیں۔ سو کیجیے نظارہ دور دور سے ہی ٹھیک رہے گا۔ خیر کچھ دِنوں بعد خبر ملی کہ نیلما اپنی غزل حلقہ اربابِ ذوق میں تنقید کے لیے پیش کریں گی اُن دِنوں تقریباً روزانہ میں پاک ٹی ہاؤس میں اسرار زیدی صاحب کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہوتا تھا لہذا حلقے کے اجلاس میں کلامِ شاعر بزبانِ شاعر سننے کا موقع ملا نیلما نے وہاں جو غزل پڑھی اُس سے ادبی تنقیدی مستریوں کو بڑی مایوسی کا سامنا کرنا پڑا اور اُنکو چاروناچار نیلما کی غزل کی تعریف کرنا پڑی غزل کا مطلع تھا۔

جمالِ یار کو دیکھوں کمالِ یار سے پہلے
میں خوشبو کی طرح مہکوں خیالِ یار سے پہلے

اچھا شاعری کا تو میں پہلے ہی (اُداس لوگوں

سے پیار کرنا) کی وجہ سے معتقد ہو چکا تھا مگر اب ذرا جو شاعرہ کو دیکھا تو وہ بھی آپ لوگوں کے ساتھ شر کرتا چلوں نیلما نے بظاہر اگر چہ اچھے فیشن کے کپڑے زیب تن کیئے ہوئے تھے ہاتھوں میں خوب رنگ لانے والی مہندی رچائی ہوئی تھی اور بال بھی کھلے چھوڑے ہوئے تھے مگر اس سب کچھ کے باوجود اُس کی شخصیت میں ایک عجیب صفیانہ پن تھا اُس کی آنکھوں میں کہیں دور رابعہ بصری قلندر کی شبعیہ ابھر رہی تھی جو اس بات کی دلیل تھی کہ اگر نیلما کے ساتھ کوئی رشتہ بن سکتا ہے تو وہ صرف اور صرف عقیدت و احترام کا ہوگا۔ پھر میں اور عفت لاہور سے شائع ہونے والے ایک مشہور اخبار کے لیے الحمراء ہال میں مشاعرے کروانے میں مشغول ہو گئے سو وہاں بھی گاہے گاہے نیلما سے ملاقات ہو جاتی مگر ہمارا تعلق رسمی ملاقات تک ہی محدود رہا پنجابی کی ایک مشہور کہاوت ہے کہ (واہ پیا جانے راہ پیا جانے) پھر یوں ہوا کہ مجھے نیلما کے ساتھ بیرونِ ملک سفر کرنے کا موقع مِلا تقریباً ڈیڑھ دو سو انسانوں کا ریوڑ جس میں تمام انواع کے لکھاری موجود تھے نیلما کمال مہارت سے اِس ریوڑ کو ہانکتی رہی۔ سیر سپاٹے کے شوقین لوگوں کو وہاں کی تاریخی اور مشہور مقامات دکھاتی رہیں، شور وغل کرنے والے مست الست گروپ کو علحیدہ رکھا، رندوں کو جام و سبوح تک رسائی کی اجازت دی، اور مجھ جیسے جو نہ تینوں میں شمار ہوتے تھے نہ تیرا میں اُن کو اپنے فیملی ممبر کی حیثیت دی۔ سو وہ پہلا تاثر جو نیلما کوٹی ہاؤس میں دیکھ کر بنا تھا آج حقیقی عقیدت اور احترام کے رشتے میں بدل گیا وہ رشتہ جسے عرفِ عام میں ایک بہن بھائی کا رشتہ کہا جاتا ہے۔ نیلما نہ صرف میری آپی ہیں بلکہ میرے بچوں کی پھوپھی ہونے کے ساتھ ساتھ خالہ بھی ہیں۔ جہاں تک نیلما کی شاعری کا تعلق ہے تو اُس کے اعتراف کے لیے تو مذکورہ بالا دو غزلیں ہی کافی ہیں مگر چونکہ معاملہ اُن کی کتاب (واپسی کا سفر) کی رونمائی کا ہے تو پھر کیوں نہ اس پہ بھی کچھ بات ہو جائے۔ واپسی کا سفر کو محسن بھوپالی اور روحی کنجاہی نے تعارفی ستور سے نوازاہ ہے یاد رہے کہ یہ دونوں محترم شاعر ادب کے اُس مقام پر فائض ہیں کہ جہاں اُن کی رائے ہی کو سند سمجھا جاتا ہے۔ واپسی کا سفر آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی اِس کی غزلوں اور نظموں میں اپنی ذات کی کرب و بلا سے گزرنے کا ذکر بھی ہے اور عام عوامی مسائل کا تذکرہ بھی کمزور اور ناچار لوگوں کے دکھوں میں برابر کی شراکت داری کا احساس بھی اور حاکم وقت کے خلاف بغاوت کی آواز بھی مگر نیلما کا اندازِ بیاں اِسقدر دھیما اور سُریلہ ہے کہ آپ اُس میں محبت کی شدت اور تنز کی کاٹ کو تو محسوس کر سکتے ہیں مگر کسی بھی جگہ اُس کے سخن میں نوحے یا نارے کا تاثر نہیں ابھرتا اور اندازِ بیاں کا یہی دھیما اور سُریلہ پن اُس کو بل عموم ہم عصر شاعروں اور بل خصوص شاعرات میں افضل و ممتاز کرتا ہے۔ آخر میں میری دعا ہے کہ وہ اسی طرح قلم کے ذریعے لوگوں کے دِلوں کو تسخیر کرتی رہیں اور ادب کی دُنیا میں اُس کا راج قائم و دائم رہے۔

❁❁❁

فرزندانِ جہانیاں

مصنف: اشرف ادیب مشہدی

صفحات: 308 قیمت: 500

ناشر: بیکن بکس، غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

اُردو اور پنجابی کے معروف شاعر

امجد شریف

کا پنجابی شعری مجموعہ

ہوکے بھردیاں سدھراں

فروغِ ادب اکادمی

گوجرانوالہ سے طلب فرمائیں

پتہ: 88 بی سیٹلائٹ ٹاؤن، گوجرانوالہ

معروف شاعر افتخار شوکت کا

پہلا شعری مجموعہ

پیار کی پہلی بارش

مکمل اہتمام کے ساتھ دیدہ زیب گیٹ اپ میں شائع ہو گیا ہے

ناشر: نستعلیق پبلی کیشنز، غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور

لبنیٰ صفدر ایک باشعور شاعرہ

دستگیر شہزاد/ٹوبہ ٹیک سنگھ

خوشگوار ترنم اور مدھر سروں سے شعر پڑھنے والی، بے حد حلیم و متین، منکسر المزاج، اخلاق و مروت کا پیکر، شرافت و وضع داری کی تیزی سے مٹتی ہوئی تہذیب کی علامت، راستی سے انحراف نہ کرتے ہوئے دوسروں کا دل رکھنے والی، دل نوازی کا پیکر، متاع گراں مایہ، عہد ساز شخصیت، ان اوصاف کی مجسم تصویر بن کر اُبھرنے والی نازک خرام اور جاذبِ نظر لڑکی کو لبنیٰ صفدر کہا جاتا ہے۔

پاکستانی ادب میں خواتین کا کردار نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔ اردو شاعری میں بہت سے قابل ذکر نام ہمیشہ دنیائے ادب کو اپنی جانب متوجہ کرتے رہے ہیں۔ پروین شاکر، زہرہ نگاہ، فہمیدہ ریاض، کشور ناہید سے ہوتے ہوئے جب ہم اور آگے بڑھتے ہیں تو دنیائے ادب کے اُفق پر لبنیٰ صفدر، یہ ہجر ہے یہ وصال ہے، تمہیں تو میرا ہونا تھا، خوشبو ہے وہ صندل کی، بارش کے موسم میں، محبت آئینہ کرلو، تم محبت کا استعارہ ہو، کی صورت میں روشن روشن نظر آتی ہیں۔ جنھوں نے کئی جہتوں سے مجموعی طور پر طرز اظہار میں خواتین کے لہجے کو معتبر کیا۔

لبنیٰ صفدر کا شمار ادبی دنیا کی ان چند خوش نصیب شخصیات میں ہوتا ہے جن کی تاریخ ان کی شہرت سے آغاز ہوتی ہے۔ ایسی شہرت وقت کی محتاج نہیں ہوتی۔ میرے نزدیک اس شہرت کی ایک بڑی اور اہم وجہ وہ عصری رویے ہیں جن کی آگہی ہمیں لبنیٰ صفدر کی شاعری میں جا بجا نظر آتی ہے۔

اپنی گردش کو چھوڑ کر آئے
چاند نکلے تو بام پر آئے
جس گھڑی تشنگی بجھی میری
کتنے دریا مجھے نظر آئے
صبح کھلتی نہ تھی یہ آنکھ میری
خواب تیرے جو رات بھر آئے

اور اس طرح کے خوبصورت اور فکر انگیز شعر کہنے والی شاعرہ کے کلام میں ''خواب'' ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ وہ جس عہد میں سانس لے رہی ہے انھوں نے اسی عہد کی باتیں ہر باشعور شاعر کی طرح اپنے گہرے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں خوبصورت استعاروں اور علامتوں کے پیرائے میں بڑے ہنر کے ساتھ بیان کیں۔ بلکہ اس حوالے سے خوبصورت شاعری کی بدولت وہ دیگر شاعرات سے آگے نکلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لبنیٰ نے غزل کی کوئی نئی زبان ایجاد نہیں کی۔ مگر ان کے کلام میں تازگی اور نیاپن دیدنی ہے۔ لبنیٰ نے علامتوں اور استعاروں سے انصاف کر کے انھیں ان کا جائز مقام دیا ہے۔ ان کے استعارے ابلاغ کے حامل اور علامتیں پُر معنی ہیں۔ یہاں بے اختیار ذہن میں ایران کی عظیم شاعرہ فروغ فرخ زاد کا نام آتا ہے۔ ناقدین ادب لبنیٰ کو سیفو اور میراں کے قریب سمجھتے ہیں۔ مگر مجھے لبنیٰ صفدر کے کلام کا مطالعہ کرتے ہوئے فروغ فرخ زاد کا خیال بارہا آیا۔ ان دونوں کے کلام میں اپنے عہد کی ترجمانی ملتی ہے۔ دونوں شاعرات کے یہاں دوسرا بڑا موضوع عشق ہے۔ دونوں کے اظہار عشق میں برجستگی و بے ساختگی پائی جاتی ہے۔ دونوں کا سوز و گداز، خود سپردگی، بے تابی و بے خوابی یکساں ہے۔ دونوں شاعرات کا کلام اچھوتی ترکیبات اور تشبیہات، نرالے استعارات سے بھرا پڑا ہے۔ تاہم ایک بنیادی فرق دونوں کے درمیان بہت واضح ہے۔ فروغ فرخ زاد اپنے اظہار میں بے حد بے باک ہے۔ جبکہ لبنیٰ کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے کہیں بے باکی کا الزام خود پر آنے نہیں دیا۔ ان کے مزاج کا دھیما پن اور حجاب ان کے کلام میں بھی شروع سے آخر تک موجود ہے۔ لبنیٰ صفدر کے یہاں تجزیہ حال بھی ملتا ہے۔ حرف بیان حال نہیں۔

لبنیٰ صفدر کے کلام میں یہ بات بھی اہم ہے کہ انھوں نے اس اظہار میں اپنے لہجے کی انفرادیت کے ساتھ سچائی کا علم بلند کیے رکھا ہے۔

شاخ سے پھول بن کے نکلوں گی
اس لیے اک شجر میں رہتی ہوں
وہ ہے بادل تو میں ہوا بن کر
ساتھ اس کے سفر میں رہتی ہوں

وہ اپنے عہد میں دوہرے معیارِ زندگی کی نفی کرنا چاہتی ہیں۔ سو ان کی شاعری میں کہیں چاند بو کر زمین سے گہن پانے والے کسان ملتے ہیں تو کہیں قامت سے بھی بڑی صلیب پا کر سکھ کو گلے لگانے سے انکار، کہیں وہ نسل ملتی ہے جو ذہن کٹنے کے سانحے سے گزر رہی ہے۔ کہیں ان کی شاعری میں دلدل سے اُگلے ہوئے بچے خوشبوؤں کا حساب کرتے ہوئے ملتے ہیں۔ وطن میں بے وطن اور گھر میں بے گھر ہونے والے بھی ملتے ہیں۔ کھلی ہوئی رات کی رانی کی مہک بھی دکھائی دیتی ہے۔

وہ بھیگی رُت کی دھنک نہ جائے
وہ آئے اور شام تک نہ جائے
میں اُس کی سانسوں میں بس رہی ہوں
مگر جو دل میں ہے شک، نہ جائے

ان اشعار کو پڑھ کر یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ان موضوعات کے تحت بھی ان کی شاعری حسن صورت، حسن سیرت، حسن زبان سے آراستہ ہے۔ جو لبنیٰ صفدر کی شاعری کا خاصہ ہے۔ لبنیٰ کہیں سماجی اور سیاسی زندگی کے تغیرات سے کائناتی جبر اور ماورائی سوالات تک پہنچ جاتی ہیں اور کہیں اپنے اطراف دم توڑتی انسانی قدروں کا جائزہ بڑی باریک بینی سے لیتی نظر آتی ہیں۔ کبھی تنہائی ذات پر بے چین ہو جاتی ہیں اور ان تمام کیفیات کی حامل شاعری کے مطالعے سے یہ بات درست ثابت ہوتی ہے کہ لبنیٰ اپنے عصر

کے حقائق کی کیسی کیسی نئی معنویتوں کو بظاہر کتنی سادگی اور بھولپن سے، مگر دراصل دانش و وجدان کی تمام ممکنہ رسائیوں کے ساتھ ایک نغمے کی طرح گنگنا دیتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں وہ خلق خدا بھی موجود ہے جو جھوٹ کے شہر میں آئینہ لگنے سے آئینہ ساز کی کھوج میں سنگ اُٹھائے ہوئے ہے۔ جو شب کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ وہ مسافرانِ شب بھی ملتے ہیں جو اسیر دور ہوئے اور وہ رہنما بھی پائے جاتے ہیں جو بکے اور شہر یار ہوئے۔ مثل اہرام وہ شہر بھی آتا ہے جہاں انسان پر نیند میں چلتی حنوط شدہ لاشوں کا گماں ہوتا ہے اور کم خواب ہوتی زیست بھی ملتی ہے جو چند لوگوں کی دسترس میں ہے۔

خبر کچھ نہیں ہے مجھے منزلوں کی
بھنور در بھنور میں سفر کر رہی ہوں

....

یہ مانا کہ تم ہو مجازی محبت
نگاہوں کا سجدہ تو بدعت نہیں ہے

....

بکھرنے ہی والی تھی دیوارِ ہستی
ترا ہاتھ کاندھے پہ رکھنے سے پہلے

....

راستہ اور کوئی ہے ہی نہیں
تم مجھے ہر طرح گوارا ہو

....

عمر گزرے گی تری آنکھوں میں
اب ٹھکانہ بھی کہاں ہونا ہے

لبنیٰ صفدر نے ہمارے معاشرے میں ان بے بس عورتوں کے مسائل کو بھی شدت سے محسوس کیا جو ہمارے عہد کے اس گھٹن زدہ ماحول کی جھوٹی بندشوں اور خودساختہ رسم ورواج میں بری طرح جکڑی ہوئی ہیں۔ لبنیٰ نے ان بندشوں سے پیدا شدہ دکھ اور نسائی بے بسی کو اپنی فکری وفنی آگہی کے ساتھ پینٹ کیا ہے۔ جیسے

تم سے ہوگا مرا یہ وعدہ ہے
عشق مجھ کو اگر دوبارہ ہو

اس کا کاندھا ہو، میرا سر لبنیٰ
شام ہو، چاند ہو، ستارا ہو

....

میں آنکھوں میں اُس کی جو اُتری تو دیکھا
سمندر کا کوئی کنارہ نہیں تھا

....

ربّ کی جانب سے اُترا ہے
عشق تیرا تو رزق میرا ہے

لبنیٰ کے وہ اشعار جو خارجیت کے ترجمان ہیں، ان میں لبنیٰ صفدر کی فکری پختگی کے ساتھ سیاسی بصیرت و دانشورانہ دردمندی بھی جھلکتی ہے اور لبنیٰ کی وسیع النظری وطن دوستی انسانی اقدار سے ان کے لگاؤ کے ساتھ ساتھ زندگی کے بارے میں ان کا ترقی پسندانہ اندازِ فکر سائنسی سوچ بھی سامنے آتی ہے۔ ان کے اشعار میں جبر و استبداد کے اندھیروں سے نفرت کا اظہار کرتی ہے۔ تو اس کا نرم لہجہ خود بخود استدلالی ہوجاتا ہے۔

یہ جذبے ہیں مالِ تجارت نہیں
مجھے کوئی قیمت نہیں چاہیے
تری آنکھ سے دور جانا نہیں
ترے دل سے ہجرت نہیں چاہیے

حقیقت الامر یہ ہے کہ ہر سچے ادیب و شاعر نے سماج کو بہتر بنانے کی جدوجہد میں ہمیشہ حتی المقدور حصہ لیا ہے اور برائیوں کو دور کرنے میں ہمیشہ کوشش کی ہے۔ جب پورا معاشرہ گلی سڑی لاش بن جائے تو دردمند دل رکھنے والی شاعرہ اپنی آنکھیں کیسے بند کرسکتی تھی۔ یہی وہ مقام ہے جب زندگی کے ذاتی تجربات اور جذبات کے اظہار میں اس کے خلوص اور سچائی کا پتا چلتا ہے۔ اپنے عہد کے پیش منظر میں ہمیں انکے یہاں ایک لطیف سی افسردگی، درد کی لذت اور جذبات کی مصوری بھرپور انداز میں ملتی ہے۔ ہمیں ان کے یہاں کتنی ہی ناآسودہ تمناؤں، آرزوؤں اور حسرتوں کی دبی ہوئی چنگاریاں ملتی ہیں۔

کتنا خوش ہے مجھے بھلا کر وہ
کل میں جس کے لیے ضروری تھی
اب وہ شاید بچھڑنے والا ہے
اس کی قربت میں آج دوری تھی

اگر ہم لبنیٰ صفدر کی شاعری کا معروضی تجزیہ کریں تو ہمیں کہیں بھی فکری ژولیدگی یا ذہنی انتشار نظر نہیں آتا۔ بلکہ ہمیں اندازِ بیان کی صفائی کے ساتھ ساتھ خیال کی تہیں ایک ایک کر کے کھلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ کیفیات کے اظہار یا ان کی وضاحت میں کسی قسم کی کمی محسوس نہیں ہوتی اور نہ ان کی شعر گوئی کی صلاحیت میں جمود کی کیفیت ملتی ہے۔ اس کے برعکس ان کا فنی شعور زیادہ روشن اور ان کی غزلوں میں زیادہ پختگی نظر آتی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ انھوں نے الفاظ کے ترنم، لہجے کے کیف اور پراثر بندشوں سے مدد لے کر جمالیات کا دلکش نمونہ پیش کیا ہے۔ ان کا کلام پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے واقعی اپنی شاعری اور فن میں خونِ جگر صرف کیا ہے۔

لبنیٰ صفدر کی شاعری میں مردوں کی بالادستی اور اس کے قوام ہونے کے خیال سے نفرت کا اظہار نہیں پایا جاتا۔ بلکہ ایک عورت کا ایسا جذبہ پایا جاتا ہے جو مردوں کی بے وفائی اور ہرجائی ہونے پر شاکی ہے۔ رفاقت سے محروم اور ناآسودہ ہے۔ افکار و تصورات، خیالات اور مصروفیات اگر لبنیٰ صفدر کو موقع دیں تو وہ اردو کی ایک عظیم منفرد غزل گو شاعرہ کی حیثیت سے اُردو شعر و ادب کے سرمائے میں گراں قدر اضافہ کر سکتی ہیں۔ لبنیٰ صفدر کی شاعری عورت کی سپردگی، ازخود رفتگی اور محبوب پر نچھاور اور قربان ہونے کی دبی دبی چیخوں، کراہوں اور بے مہریوں کے متضاد جذبات کی اور غیر معمولی لڑکی کی حسرتِ ناتمام کی ترجمان ہے۔

آنکھوں میں آ بسے میرے صدیوں کے رتجگے
آنکھوں سے رنگ خواب کے وہ شخص اُڑا گیا
کس کو لگا تھا یہ موسم بہار کا
شاخوں سے کون آ کے پرندے اُڑا گیا
موسم گلاب کا بھی تو کرتا نہیں نہال
مجھ کو یہ تیرا ہجر تو پتھر بنا گیا

لفظ کو حرمت معانی دی...... صورت اعتبار دی میں نے

صائمہ نورین بخاری

احمد فراز نے کیا خوب لکھا تھا......

''شاعری بہت مشکل چیز بھی ہے اور بہت آسان بھی...... آسان اس لئے کہ آپ کو ہر طرف بے شمار شاعر نظر آئیں گے مگر مشکل اس وقت ہو جاتی ہے جب اتنی بڑی تعداد میں لکھنے والوں کی مخلوق موجود ہو اور اس میں اپنا الگ تشخص اور قد و قامت قائم کیا جائے۔''

اور ایسا ہی الگ تشخص اور قد و قامت رکھنے والے جناب اشرف یوسفی اپنے کلام کی کلاسیکی تربیت اور منفرد رنگ سخن کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں محبت کا مرکزی موضوع نظر آتا ہے مگر ان کا سماجی شعور ان کے کلام کو صرف اسی موضوع تک محدود نہیں کرتا بلکہ ان کی غزل میں زندگی کے تمام موضوعات ممکنہ پہلو تابناک نظر آتے ہیں۔ ان کے نظریاتی پہلو، روحانی عقیدت اور شعری تربیت میں تنوع انہیں معاصرین میں ایک منفرد اور نمایاں مقام دلاتا ہے غزل میں دینی سطح کی واردات کا خوب صورت مظاہرہ ملاحظہ ہو۔

میری مٹی کو شکل جس سے ملی
مجھ کو اس چاک کی زیارت ہو
تو نے جس خاک پر قدم رکھے
کاش اس خاک کی زیارت ہو

جب شاعر کی دلی کیفیات، احساس جمال کی روش پر گامزن ہونے کی ترغیب دیتی ہیں تو دل کے نگر میں اجالا بکھرنے لگتا ہے اور صفحۂ قرطاس پر اداس آنکھوں کی تصویر ابھرنے لگتی ہے۔

رات ستارے آنگن اور اداس آنکھیں
تیری باتیں، کرتے کرتے بھیگ گئے

....

عکس مہتاب تھا پانی میں پلٹ آیا ہے
پھر وہ کردار کہانی میں پلٹ آیا ہے
میں کہیں اپنے کنارے پہ سفر کرتا تھا
وہ کسی اپنی روانی میں پلٹ آیا ہے

انداز بیان، نئی علامتوں، نئی تشبیہات کے خوب صورت امتزاج نے ان کی غزل کو نئے آہنگ اور نئی خوشبو سے ہمکنار کیا ہے۔ ان کی غزلوں میں رمزیت ایمائیت اور اختصار اضافی خوبیاں ہیں۔ زندگی کے فلسفے کو چھوٹی بحر میں کیا خوب بیان کرتے ہیں۔

آنکھوں کے آر پار ہے اور صبح و شام ہے
یعنی اک انتظار ہے اور صبح و شام ہے
اندر بس اک سکوت، لہو چاٹتا ہوا
باہر اک انتشار ہے اور صبح و شام ہے

....

اس کی آنکھوں کو بس چھوا میں نے
ان سے شام و سحر نکل آئے

شاعری تخیلی بصیرت کی وسعت اور لطافت کا نام ہے ایک سچا شاعر اب بصیرت کا امین ہوتا ہے جب عصری نظم کے حوالے سے جناب اشرف یوسفی کا نام لیا جائے تو ہمیں ان کی نظم میں حیاتی، نفسیاتی اور سماجی موضوعات عصری نظم نگاروں کے مقابلے میں زیادہ واضح نظر آتے ہیں۔ یہ نظمیں اس

''جدائی کا فیتہ''

اپنے فاصلوں پر رکھی ہوئی
چائے اور سانسیں ٹھنڈی ہو جاتی ہیں
اور میبل کسی گہری اداسی میں
ڈوب جاتا ہے
میرے ہاتھ کسی ستارے تک نہیں پہنچتے
اور شام دہلیز کے اندر آ جاتی ہے
ناگن کی طرح پھنکارتی ہوئی''

اشرف یوسف جدید شعری روایت کے ان شاعروں میں سے ہیں جن کی شاعری میں جدت کی بنیادیں روایت پر قائم کی گئی ہیں۔ انہوں نے نئی علامتوں کو اپنے عہد اور تخلیقی باطن سے برآمد کیا۔ وہ کہتے ہیں

''ہم لوگ شہر حرف و معانی کے لوگ تھے
چوپال کے نہیں تھے کہانی کے لوگ تھے
تعمیر گان شوق تھے منزل کہیں نہ تھی
موج ہوا ہے، نقل مکانی کے لوگ تھے
مٹی کے خواب گر تھے جو مٹی سے جا ملے
کشتی کے ہو گئے ہیں جو پانی کے لوگ تھے''

تاثرات اور احساسات کو فطری انداز میں رنگ تغزل دینا، ان کی خوبی ہے۔ روحانی وارفتگی کے ذائقوں سے ہمکنار ہوتے ہوئے یہ اشعار

ایک عمدہ تخیل کی ہواز بیان کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

اس ایک اشک سے دریا نہیں بنانا مجھے
ہجوم شہر تماشا نہیں بنانا مجھے
بس اک چراغ بنانا ہے اس ہتھیلی پر
اور اس چراغ کا سایا نہیں بنانا مجھے
یہ اختیار بھی اس نے نہیں دیا مجھ کو
کہ کیا بنانا ہے اور کیا نہیں بنانا مجھے

اشرف یوسفی کے تخلیقی ذہن کی عکاسی، سوچ وفکر کا محور اور سادہ لفظوں کو بہت خوبی سے برتنے کا عمل اس امر کی دلیل ہے کہ انہوں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اور اس کی حقیقت کو رجائیت کے پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے بخوبی پرکھا ہے...... لیکن زندگی اور موت کی کشمکش کو ایک تلخ حقیقت قرار دیتے ہوئے فلسفہ زندگی کچھ اس طرح بیان کیا کہ درد کی ایک لہر اشعار میں دوڑنے لگی۔ وہ کہتے ہیں۔

ناخدا نے کہاں اتار دیا
ہر مسافر خدا بنا ہوا ہے
رفتگاں کا نشاں نہیں ملتا
دور تک راستہ بنا ہوا ہے

....

میری صورت کوئی دیکھے دنیا
کیسے لکھتی ہے یہ کتبے دنیا
راستہ بھول کے آنکلے ہیں
ہم ترے لوگ نہیں تھے دنیا

....

چاند، خوشبو، ہوا، شام، تصویر، رستہ، خار، دلہیز یہ سب الفاظ استعارات کی ایک بامعنی دنیا تخلیق کرتے ہوئے، ان کی شاعری میں معنویت کے نئے دریچے وا کرتے ہیں...... غزل میں ایک شاعر کی تخیل کے علاوہ انکشاف ذات کے امکانات بھی بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ ہجر ومحبت کے گہرے رنگوں سے سجا یہ شعر ملاحظہ ہو......

ہجر میں خامشی نہیں جاتی
آخری بات کی نہیں جاتی

مزید کہتے ہیں:

ایک تحریر ہے محبت بھی
خود لکھی اور پڑھی نہیں جاتی

اشرف یوسفی کی تخلیقات شدید حسیاسیت کا مجموعہ ہیں ان میں روح عصر کی دھڑکن سنائی دیتی ہے۔ عصر حاضر کے حوادث، سانحے اور مصائب کا ذکر اور فکر درد کی صورت میں ہر شاعر کے قلم سے نکلتا ہے۔ امتحان در امتحان، زندگی کی کٹھن راہیں کس کے لئے سہل ہوئیں۔ شکست خواب کی منزل میں رستوں کے الجھاؤ کئی سفاک منظر تشکیل دیتے ہیں۔ شکست خواب کی منزل میں رستوں کے الجھاؤ کئی سفاک منظر تشکیل دیتے ہیں۔ ہماری قوم نے سانحہ پشاور کے حوالے سے جو کرب سہا اس کا اندازہ کرنا ہی محال ہے۔ اور اس کرب کو اشرف یوسفی نے شعر کی صورت میں اس طرح ڈھالا کہ معصوم طالب علموں کی لہو رنگ تصویریں، آنکھوں میں طوفان شک لے آئیں۔

میرے اندر کیسا چشمہ پھوٹ پڑا
میں نے کس تصویر کے آنسو پونچھے ہیں

تمناؤں کے فرسودہ در پر، امیدوں کے چراغ جلانے والے اشرف یوسفی صاحب کی شاعری کے رنگ باتیں کرتے ہیں۔ اور ان کی یہ خوب صورت باتیں قارئین خوب سمجھتے اور سراہتے ہیں۔ یہی ایک بلند پایہ شاعر کی خوبی ہے کہ وہ اپنے قاری کے دل میں گھر کر جائے...... اور اس کے تخیل میں زندگی کے تمام موضوع، ممکنہ پہلو تابناک نظر آئیں...... اسی لئے وہ کہتے ہیں

لفظ کو حرمت معانی دی
صورت اعتبار دی میں نے

سرگودھا میں مقیم نامور ادیب
شاکر کنڈان
کی سیرت اور حمد ونعت کے حوالے سے لکھے گئے مضامین پر مشتمل کتاب
نغمہ محمدی سے نکلی ہوئی
آب جو
مکمل اہتمام کے ساتھ شائع ہوگئی ہے
صفحات 330 قیمت 500 روپے
اہتمام: مثال پبلشرز
رحیم سنٹر پریس مارکیٹ، امین پور بازار فیصل آباد

رضوانہ سیدّ علی

سعدیہ بتول/راول پنڈی

رضوانہ سید علی 1952ء میں کراچی میں پیدا ہوئیں۔ان کے والد شاعر اور ایک علم دوست انسان تھے۔کتابوں سے لگاؤ اور لکھنے پڑھنے کا شوق والد صاحب سے ورثے میں ملا لہٰذا چھوٹی سی عمر میں بڑی بڑی کتابیں پڑھ ڈالیں۔رضوانہ سید علی کا بچپن اور لڑکپن لاہور میں گزرا۔بچوں کے مختلف رسائل مثلاً نونہال، تعلیم و تربیت، پھول، بچوں کی دنیا اور بچوں کا باغ میں کہانیاں لکھا کرتی تھیں۔ان سے ہمارا تعلق بھی بچوں کے رسائل کے توسط سے قائم ہوا۔ہم بچپن سے کتب بینی کا شغف رکھتے تھے اور بچوں کے اکثر رسائل ہمارے زیر مطالعہ تھے۔رضوانہ سید علی کی طبع زاد کہانیوں کے علاوہ دوسری زبانوں سے ترجمہ شدہ کہانیاں بھی چھپتی تھیں جو ہم سب بہت شوق سے پڑھا کرتے تھے۔وقت کا پہیہ کچھ آگے سرکا تو رضوانہ سید علی کے کالم اخبارات میں پڑھے وہ 2004ء سے 2006ء تک روزنامہ ''اوصاف'' اسلام آباد اور 2009ء میں اسلام آباد ٹائمز میں کالم لکھتی رہیں۔2012ء سے اب تک روزنامہ ''نئی بات'' سے بطور کالم نگار وابستہ ہیں۔2003ء میں ان کے کالموں پر مشتمل کتاب ''نوک قلم پہ خار'' منصۂ شہود پر آئی۔انہیں معاشرتی، تعلیمی، سیاسی اور معاشی مسائل کا پورا ادراک ہے۔وہ حالات حاضرہ پر کڑی نظر رکھتی ہیں اور اپنے کالموں کے ذریعے عوام میں تنقیدی نقطہ نظر اور عصری شعور پیدا کرنے کی خواہاں ہیں۔رضوانہ سید علی اب راولپنڈی میں مقیم ہیں۔سردیوں کی ایک خنک شام میں مجھے ان سے بالمشافہ ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔میں ان سے ملنے ان کے گھر گئی تو بہت تپاک سے انہوں نے ہمارا خیر مقدم کیا۔وہ انتہائی خوش شکل، خوش لباس اور نفیس شخصیت کی مالک ہیں۔بہت شائستگی سے دھیمے لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر کلام کرتی ہیں۔گرما گرم چائے کے ساتھ اپنے ہاتھ سے بنائے گئے گجریلے سے انہوں نے ہماری تواضع کی اور ہم ان کی تحریروں کے ساتھ ساتھ ان کے ہاتھ کے ذائقے کے بھی معترف ہوگئے۔وہ ایک محبّ وطن اور ہمدرد دل رکھنے والی خاتون ہیں۔پاکستان کے نظام تعلیم کی کمزوریوں اور خرابیوں پر ان کا دل بہت کڑھتا ہے چونکہ خود بھی علم و تعلیم کے شعبے سے وابستہ ہیں اس لیے تعلیمی نظام سے ان کا تعلق بالواسطہ ہے۔1995ء میں انہوں نے پاکستان کے تعلیمی مسائل پر ایک کتاب ''سہ رنگا نظام تعلیم کے نام سے لکھی جس میں انہوں نے ہمارے تعلیمی نظام کی کمزوریوں اور نقائص کو موضوع بنایا اور بہتری کے لئے تجاویز بھی پیش کیں۔وہ ایک کامیاب افسانہ نگار بھی ہیں۔ان کی گرفت قلم پر مضبوط ہے اور وہ معاشرتی حالات و واقعات کی گہری بصیرت رکھتی ہیں۔2007ء میں ان کے افسانوں کا مجموعہ ''پیلے پھولوں کا نوحہ'' منظر عام پر آیا علاوہ ازیں ان کے مضامین اور افسانے مختلف رسائل مثلاً اردو ڈائجسٹ، سیارہ ڈائجسٹ، چلمن اور آنسہ میں بھی جگہ پاتے رہے۔ان کا اصل شاہکار تو ان کا ناول ''خواب گزیدہ'' ہے جو 2011ء میں چھپا۔اس ناول کی کہانی کا آغاز اورنگ زیب عالمگیر کے عہد سے ہوتا ہے اور عہد حاضر کے منظر نامے تک پہنچتا ہے۔اس میں ایک عہد کی تاریخ اور ایک تہذیب کے زوال کی داستان پنہاں ہے۔انہوں نے ''خواب گزیدہ'' میں انسان کی مختلف جبلتوں، معاشرتی ناہمواریوں اور جاگیرداری نظام کی قباحتوں کو موضوع بنایا ہے۔انسان کی ذہنی کشمکش، نفسیاتی مسائل اور دوغلے پن کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔غرضیکہ رضوانہ سید علی کثیر الجہت شخصیت کی مالک ہیں ان کا مطالعہ وسیع، مشاہدہ عمیق اور انداز بیان پر تاثیر ہے۔وہ شاعری بھی کرتی ہیں۔انہوں نے بچوں کے لئے بھی بہت سی کتب تحریر کی ہیں جن میں بچپن جھروکے سے، ''عبدل کا خواب''، ''گھومیں نگر نگر'' ریشم انوکھا سفر'' ''ڈرنا نہیں'' اور ''اب جنگ نہ ہو'' قابل ذکر ہیں۔وہ گہرا تفکر اور پختہ سوچ رکھنے والی خاتون ہیں۔ان کی اردو ادب اور تعلیمی نظام کی بہتری کیلئے کی جانے والی کاوشوں کو ہر سطح پر سراہا گیا ہے ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے دعویٰ اکیڈمی نے انہیں ایوارڈ فار بیسٹ سٹوری سے نوازا۔پنجاب سکولنگ لندن سے بھی انہیں بیسٹ اسٹوری ایوارڈ ملا۔انہیں نیشنل بک فاؤنڈیشن نے بھی اعزاز سے نوازا مزید برآں کراچی یونیورسٹی گریجویٹ فوم کینیڈا کی طرف سے رضوانہ سید علی کی مجموعی ادبی خدمات پر انہیں الجامع ایکسیلنسی ایوارڈ پیش کیا گیا۔

فلمی اور علمی شخصیت آصف جاہ

فراست بخاری/لاہور

لاہور کے بارہ دروازے ہیں جن میں ایک بھاٹی دروازہ ہے۔اس دروازے میں ایک بازار مشہور ہے۔حکیماں بازار حکیم احمد شجاع نے اس بازار کو چیلسی آف لاہور کہا ہے۔ کیوں کہ اس بازار میں ادبی اور علمی شخصیت رہتی رہی ہیں حضرت علامہ اقبال بھی کافی عرصہ یہاں رہے۔ اور مرزا ادیب بھی پاکستان کے مایہ ناز کرکٹ کے کھلاڑی عبدالحفیظ کاردار اور دبنگ وکٹ کیپر اور بلے باز امتیاز احمد بھی یہاں رہتے تھے۔ بازار حکیماں میں کوچہ پہلواناں ہے جہاں مشہور مزاحیہ فلمی اداکار آصف جاہ 1924ء میں سید منور علیشاہ المقلب ''علی کا شیر'' کے ہاں پیدا ہوئے۔ان کے بڑے سید سید مٹھا کاظمی ہیں جن کے نام پر سید سید مٹھا بازار ہے اور ان کا مزار یہاں واقع ہے۔یعنی آصف جاہ کا تعلق ایک خالص مذہبی گھرانے سے تھا۔آصف جاہ کے چار بھائی تھے۔ان کے بھتیجے سید حبیب پاشا (المعروف ہامون جادوگر) ہیں۔ آصف جاہ کے بھانجے آفتاب شاہ بھی اسٹیج ڈرامے میں بطور پروڈیوسر۔ہدایت کار اور اداکار تھے۔لیکن وہ بھی اداکاری چھوڑ گئے ہیں۔

آصف جاہ نے دو شادیاں کیں پہلی شادی 1952ء اور دوسری شادی 1959ء میں کی۔ آصف جاہ کے ہاں پانچ بیٹے اور سات بیٹیاں ہیں۔تین بیٹے بچپن ہی میں اللہ کو پیارے ہو گئے جن میں سے دو مکان کی چھت گرنے سے فوت ہوئے۔دو بیٹے ازلی حسنین (پپو شاہ) اور ابوذر تھے۔ازلی حسنین شاہ صاحب کی وفات کے 9 سال بعد عالم شباب میں انتقال کر گئے اور چھوٹے بیٹے سید ابوذر کاظمی مشہور لندن میں سرجری کے ڈاکٹر ہیں۔

آصف جاہ نے ابتدائی تعلیم شیرانوالہ گیٹ سکول سے حاصل کی اور میٹرک بھی اسی اسکول سے کیا۔ایف ایس سی اسلامیہ کالج ریلوے روڈ سے کی۔انہیں اداکاری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ پاکستان اور ہندوستان کی تقسیم سے پہلے اسٹیج ڈراموں میں کالج میں حصہ لیا۔بعد میں ایک اسٹیج ڈرامہ کیا جس میں یہ ہیرو تھے اور گیتا بالی ہیروئن تھی۔اس ڈرامے کا نام تھا ''مجھے سنبھالو'' یہ خاص و عام میں مشہور ہوئے تو ان کے والد سید منور علیشاہ جن کو لاہور شہر کے لوگ علی کا شیر کہتے تھے ان کو جب اپنے بیٹے کے بارے میں پتا چلا تو انہوں نے آصف جاہ کی سرزنش کی اور سخت الفاظ استعمال کئے اور گھر سے نکال دیا۔یہ کہتے ہوئے کہ ''آصف اخیر مولے نے ہٹی تے بہنا اے'' شاہ صاحب کو اداکاری کا جنون تھا۔خیر فلموں میں بھی کام شروع کر دیا۔اور مشہور ہو گئے۔آصف جاہ نے ٹائٹل رول بھی کئے مگر شیخ چلی کا رول آج بھی فلم ہستیوں کو یاد ہے اور یہ رول یادگار ہے۔ جیسے کرتار سنگھ میں علاوالدین ملنگی میں اکمل۔ہیر اور ہیر سیال میں کیدو کا رول اجمل خان اور مسرت نذیر کا شہید ادو یکے والی فلم میں یادگار رول کیے۔

آصف جاہ نے پنجابی اور اردو دونوں فلموں میں اداکاری کے جوہر دکھائے اور خوب دکھائے۔آصف جاہ نے عروج ہی میں فلمی دنیا کو خیر باد کہنے کا فیصلہ کر لیا۔میں نے اس کی وجہ پوچھی تو شاہ صاحب نے کہا کہ میں آئینے کے سامنے کھڑا ہوا تو مجھے والد صاحب کی بات یاد آئی اور دوسری وجہ یہ تھی ظریف مرحوم کے بھائی منور ظریف۔زلفی اور رنگیلا کے لئے جگہ چھوڑنی تھی۔یہ تینوں میری بہت عزت کرتے تھے اور استاد مانتے تھے۔رنگیلا تو شروع شروع شاہ صاحب کے ہاں بادشاہی مسجد کے عقب میں رہا بھی۔ فردوس۔ ناہید اداکارہ۔اور بخاری اور اکمل بھی شاہ صاحب کا بہت احترام کرتے تھے۔

آصف جاہ کی یادگار فلموں میں۔چوہدری۔ چاچا خامخواہ سات لاکھ اور شیخ چلی وغیرہ ہیں۔

آصف جاہ کا فلمی حوالہ تو سب جانتے ہیں پروڈیوسر۔ہدایت کار۔اداکار۔گیت نگار تھے مگر بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ علمی شخصیت بھی تھے۔ 1971ء سے 1994ء یعنی ان کی موت تک مجھے ان کی قربت حاصل رہی۔ ملک جاوید مرحوم مرزا جمیل میاں صلاح الدین۔نواب وجاہت علی خان اور بابر بٹ ہم سب ان کی قربت میں رہے اور اچھی اچھی باتیں سننے کو ملتیں۔ دینی اور دنیاوی

راہنمائی ہم حاصل کرتے رہے۔ آصف جاہ ایک سیدھے سادے سچے اور کھرے انسان تھے۔ اہل قلم، اہل علم اور اہل ادب تھے۔ اہل فن بھی۔ انگلش، اردو، ہندی، عربی اور پنجابی خوب جانتے تھے۔ شاعری بھی کرتے تھے۔ ان کے چند منفرد اشعار درج ذیل ہوں۔

بے نظیر کے دور میں ایک ملاں نے اپنی بیوی کو استری سے داغا اور اذیتیں دیں کہ اس کی حالت غیر ہوگئی اس کو علاج کے لئے باہر حکومت نے اپنے خرچ پر علاج کرایا یہ خبر اخبار مین چھپی تو شاہ صاحب ہاتھ میں اخبار لئے آئے ہم درج بالا قربت رکھنے والے بیٹھے تھے تو شاہ صاحب بولے حضرت جی (ان کا تکیہ کلام) کا خیال آیا ہے سنیں۔

ملاں کی سیاہ کاریاں جب سامنے آئیں
شک پڑ گیا، ابلیس کہیں بخشا نہ جائے
(آصف جاہ)

ایک اور شعر منافقت کے بارے میں:
منافقانہ سا اک سجدہ کر تو سکتا تھا
جانے کیا سوچ کے ابلیس نے انکار کیا
(آصف جاہ)

جاری جو میرے خوں میں مہلی سی لہر ہے
یہ میرے ہی پالے ہوئے سانپوں کا زہر ہے
(آصف جاہ)

تادم زیست حراست میں رہے لوگوں کی
ہم بندھے کھنچتے رہے رشتوں کی زنجیروں سے

....

لوگ ہیں خواب مسلسل میں انہیں سونے دو
کھل گئی آنکھ تو ڈر جائیں گے تعبیروں سے

میں بھی اک ایسے مصور کا ہوں شاہکار آصف
جو بدل دیتا ہے تصویروں کو تصویروں سے
(آصف جاہ)

شاہ صاحب کی پنجابی شاعری:
ساہواں دی مالا نے اک دن تے ٹٹنا ایں
پنجرے چوں پنچھی نے اک دن تے چھٹنا ایں
(آصف جاہ)

تنیوں اپنا پتہ میں کیہ دساں بے نام تے بے نشاں ہاں میں
امر کسے سال میں سالیناں جتوں پچھیں تے بے جان ہاں میں
کئی دفتر کتاباں دے پڑھ چھکاں بڑے بڑے سناواں تو سبق لتے
مکھ یار داویکھا، علم بھلیا، انج جاپیا جویں نادان ہاں میں
بھانویں لکھ ہاں میں گنہگار آصف میرا کاتباں کول حساب تے ہے
تیری بخشش والا نت حساب کوئی نئیں میتوں معاف کردے پشیمان ہاں میں
(آصف جاہ)

شاہ صاحب کی گفتگو شائستگی، مزاج اور دین و دنیا کی حقیقتوں سے بھر پور ہوتی تھی۔ جو کہ سننے والے کے دل پر اثر کرتی تھی۔ بادشاہی مسجد کے امام مولانا عبدالقادر آزاد کا جملہ اب تک ہمارے دلوں پر نقش ہے آپ نے فرمایا تھا کہ شاہ صاحب باعلم اور باعمل انسان ہیں۔ ان کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان کیا کسی انسان کو بھی گزند یا دکھ نہیں پہنچا۔ یہی مومن کی معراج ہے۔

آپ کی باتیں اور آپ کی یادیں ہمارے دلوں میں پائندہ و تابندہ رہیں گی۔ آپ فلمی، علمی اور ایک روحانی شخصیت کے مالک تھے۔ آپ کے اس شعر پر میں مضمون کا اختتام کرتا ہوں۔

اللہ یکتا ہے، محمدؐ بے مثل علیؑ لاثانی
میرے ایمان کی بنیاد یہی ذاتیں ہیں
(آصف جاہ)

آپ کی زندگی کا سفر 1924ء سے ستمبر 1994ء تک ہے۔
(اُن کی برسی کے حوالے سے خصوصی تحریر)

نامور سفرنامہ نگار اور محقق
فقیر اللہ خاں
کی مشہور تصنیف ''المدینہ'' کے بعد
تازہ کتاب
المکۃ المکرمہ
شائع ہوگئی ہے
صفات 236 قیمت: 400 روپے
ناشر: مکتبہ اسلامیہ
ہادیہ حلیمہ سنٹر غزنی اسٹریٹ اُردو بازار، لاہور

سچائیاں (افسانچے)
مصنف: ڈاکٹر اخلاق گیلانی
صفحات: 182 قیمت: 300 روپے
سٹار کانٹی نینٹل، غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور

ہائیر ایجوکیشن

احمد سعید/ پرتگال

"ایف اے آنرز" کے سالانہ پیپر ختم ہوئے تو میں ہائیر ایجوکیشن کے لئے فرانس جانے کا سوچنے لگا۔ حالانکہ رزلٹ تک صرف مجھے یہ سوچنا چاہیے تھا کہ میں پاس بھی ہو جاؤں گا کہ نہیں۔ اور اگر ہو جاؤں گا تو کیسے؟

"ایف اے آنرز شروع میں اس لئے لکھا کہ BA بھی جب تین سال کا ہو تو "آنرز" ہو جاتا ہے۔ ویسے تو ایف اے تین سال کا پاکستان میں نہیں تھا لیکن میں نے سپلیاں لے کر اسے 3 سال میں کنورٹ (منتقل) کر لیا تھا۔

سب سے پہلے ابا جی کو اپنے عزائم سے آگاہ کیا کہ میں ہائر ایجوکیشن کے لئے بھائی کے پاس "فرانس" جانا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ بہت خوب تم ایم اے کر لو اور پھر ہائیر ایجوکیشن کے لیے چلے جانا۔ میں نے کہا جی کہ میں ابھی جانا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ انٹرمیڈیٹ کے بعد کونسی ہائیر ایجوکیشن؟ میں نے کہا کہ اپنی اپنی سوچ کی بات ہے۔ انہوں نے مجھے ایسے دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں کہ پہلے میں تمہاری سوچیں نہ درست کردوں۔ خیر میں نے کہا، آپ ہائیر کو نکال دیں لیکن ایجوکیشن کے لئے تو جانے دیں۔ کہنے لگے، رزلٹ آنے دو پھر دیکھتے ہیں۔ دل نے کہا کہ پھر کیا دیکھنا فرانس، آپ نے پاکستان نہیں دیکھنے دینا۔

ایک صبح میں اٹھا تو گھر میں امریکہ کی باتیں کانوں میں پڑیں۔ میں نے امی جان سے جا کر پوچھا کہ امریکہ کہاں سے آ گیا بیچ میں؟ میں تو سارا دن فرانس فرانس کرتا ہوں۔ وہ کہنے لگیں کہ تمہارے چچا اور ان کی فیملی امریکہ سے آ رہے ہیں۔ اور ان کو تم نے لے کر گھومنا پھرنا ہے۔ میں نے کہا کہ جون، جولائی کے مہینوں میں پیدل ان کو لے کر گھومنا پھرنا ہے؟ کہنے لگیں کہ باقی باتیں اپنے ابو سے پوچھ لو۔ ابا جی کہنے لگے کہ گاڑی کرائے پہ لینی ہے اور تم نے چلانی ہے۔

یہ سن کر کے میں نے چلانی ہے مجھے لگا کہ میں فرانس ہی پہنچ گیا ہوں۔ بلکہ امریکہ سے گھومتا ہوا فرانس پہنچا۔ گاڑی چلانی تقریباً مجھے اب آ گئی تھی۔ بس پیچھے کرنی اور گھر کے گیراج میں کھڑی کرنی نہیں آتی تھی۔ سیدھی سیدھی میں بہت اچھی چلا لیتا تھا، بس ذرا ٹریفک زیادہ نہ ہو تو...... بلکہ بالکل ہی نہ ہو تو پھر تو میں کیا ڈرائیونگ کرتا تھا۔ بس میں خود کو دیکھتا جاتا تھا کہ کیا ٹھاٹھ سے سیٹ بیٹھا ہے گاڑی پر، زیادہ ٹریفک میں بھی میں دیکھتا رہ جاتا تھا کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔

گاڑی "رینٹ" پہ لینے کی ذمہ داری ایک کزن کو سونپی گئی۔ میں گاڑی لے کر آیا راستے میں دو تین بار بند ہوئی ایک بار خود ہی چل پڑی تو دوسری بار مکینک کے ہاتھوں چلی، یعنی مکینک کو بلانا پڑا۔ کزن کو میں نے فون پر بتایا تو وہ کہنے لگے یار بیٹری ہی صرف خراب ہے نا۔ اگر کبھی کبھار تنگ کی تو دھکا لگا لینا ورنہ جا بجا مکینک تو ہیں ہی۔ ایسے ہی میں نے ابا جی کو بتا دیا کہ ایسا کوئی مسئلہ نہیں گاڑی میں، ابا جی کہنے لگے کہ اس مسئلہ (گاڑی) کو گھر نہ لے کر آنا، فوری واپس کر کے آؤ۔ میں نے کہا کہ رات کو چچا جان آ رہے ہیں صبح اسے واپس کر کے کوئی اور لے لیں گے۔

انھوں نے ایک نہ سنی بلکہ مجھے اچھی خاصی سنا دیں۔ میں نے گاڑی واپس کی اور گاڑی خود ڈھونڈنے کا ارادہ کر لیا کیونکہ مجھے نظر آ رہا تھا کہ ڈرائیونگ میرے ہاتھ سے جا رہی ہے۔

ایک رینٹ اے کار والا کچھ جاننے والا محسوس ہوتا تھا۔ اس نے چھوٹی سی گاڑی دے دی کہ گیس کم کھائے گی۔ میرے لیے چھوٹی کار زیادہ کار آمد تھی۔ ڈرائیونگ کا ایکسپرٹ جو بہت تھا اپنی نظروں میں۔ انکل اپنی فیملی کے ساتھ رات کو آئے۔ رات تک میں نے بھی اس گاڑی پہ اچھے خاصے ہاتھ صاف (سیدھے) کر لیے تھے۔ انکل گاڑی کو دیکھ کر کہنے لگے کہ اس سے چھوٹی گاڑی نہیں ملی؟ میں نے کہا انکل اس سے چھوٹی گاڑی پاکستان میں ابھی آئی نہیں۔

حیرانگی سے مجھے دیکھا اور کہنے لگے کہ یعنی اگر ہوتی تو تم نے لے آنی تھی۔ اس کی جگہ وہ۔ میں نے کہا کہ انکل یہ گاڑی "کم خرچ بالانشیں ہے"

ہنس کر کہنے لگے کہ چلو صبح دیکھتے ہیں کیا کرتی ہے یہ گاڑی ہمارے ساتھ۔ یقیناً ان کا مطلب یہی تھا کہ تم ہمارے ساتھ کیا کرتے ہو۔ جون کا مہینہ تھا۔ اس سال گرمی نے دس سالہ گرمیوں کا ریکارڈ توڑ دیا تھا۔ صبح ہوتے ہی آنٹی نے مجھ سے پوچھا کہ اس کا اے سی (ایئر کنڈیشنر) بھی صحیح کام کرتا ہے کہ نہیں؟

میں نے کہا اس کا ہیٹر بھی چلتا ہے

کہنے لگیں کہ ہیٹر کہاں سے آ گیا بیچ میں۔

میں نے کہا کہ ایسے ہی گاڑی کے کارہائے نمایاں بیان کر رہا ہوں۔

کہنے لگیں گاڑی کیا کوئی ریسنگ چیمپئن شپ جیت کے آئی ہے۔

میں نے دل میں سوچا کہ میں نے کل سارا دن چلائی ہے اور یہ پوری صحیح سلامت بچ کے آئی ہے، اور کیا چیمپئن شپ جیتے گی؟

خیر انکل آنٹی کو رشتہ داروں کی طرف لے کر نکل پڑا۔ فوری طور پر اے سی چلایا اور بتایا کہ اس کا اے سی بہت اچھا ہے۔ رات بڑی ٹھنڈی ہوا دے رہا تھا۔

انکل کہنے لگے کہ رات کو چھت پہ پنکھا بھی ٹھنڈی ہوا ہی دیتا ہے۔

میں نے سوچا انکل امریکہ سے محکمہ موسمیات کا کورس کرکے آئیں ہیں۔ آنٹی کہنے لگیں ابھی تک ٹھنڈ نہیں ہوئی گاڑی میں، میں نے کہا کہ بڑی روڈ پر چڑھیں گے تو ٹھنڈ کرے گی۔ کہنے لگیں کہ چھوٹی روڈ پر کیا کیا کرے گی؟ میں نے کہا، جی تھوڑی تھوڑی ٹھنڈ، خیر بڑی روڈ بھی آ گئی پر ٹھنڈ نہیں آئی۔ کہنے لگیں کہ اس گاڑی کو فوری واپس کرو۔ مجھے تقریباً یقین ہو گیا کہ گاڑی تو گئی سو گئی پر ڈرائیور بھی گیا اب کے۔

آہستہ سے ڈرتے ڈرتے میں نے پوچھا کہ گاڑی میں بڑی والی لے آتا ہوں۔ کہنے لگی کہ ہاں بالکل درست جلدی سے کوئی اچھی گاڑی کا بندوبست کرو۔

میری جان میں جان آئی کے ڈرائیونگ ابھی بھی داؤ پہ ہے پر بچ گئی ہے۔

اب کہ میں نئی اور بڑی گاڑی لانے میں کامیاب ہو گیا تھا پر ابھی صحیح چلانے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ میں دو تین دن گاڑی سلو سپیڈ پہ ہی چلاتا رہا، بھئی اپنی عزت اور گاڑی اپنے ہاتھ ہی اچھی لگتی ہے۔

ایک دن آنٹی ابو کو کہنے لگیں کہ بھائی جی احمد گاڑی بہت اچھی چلاتا ہے۔

اب میں خوشی کی بجائے پریشان ہو گیا کہ ابا جی یہ نہ فرما دیں کہ ابھی تو یہ چلانا سیکھ رہا ہے اور آپ نے بہت اچھی چلانے کا سرٹیفکیٹ بھی دے دیا۔ تھوڑا سا مسکرانے کے بعد ابا جی خاموش ہی رہے، خیر پندرہ دن اسی طرح آہستہ آہستہ چلا کر اپنی عزت اور اپنی ڈرائیونگ بچاتا رہا اور وہ واپس امریکہ چلے گئے کہ یہ کہتے ہوئے کہ ایسی ڈرائیونگ میں نے کہیں نہیں دیکھی۔ اور مجھے لگا کہ مجھے پندرہ دنوں میں امریکہ کا ڈرائیونگ لائسنس مل گیا ہے۔

فرانس میں ہائیر ایجوکیشن کے لئے میں اسلام آباد نکل گیا۔ وہاں الیاں دے فانس جا کر اپنا مدعا بیان کیا۔ میں نے تین ماہ کا فرنچ کورس ایگری کلچرز یونیورسٹی سے مکمل طور پہ مکمل کر لیا ہے اور انٹرمیڈیٹ بھی بس تقریباً ہوا سمجھیں۔

وہ کہنے لگے کہ ہمارے لئے کیا حکم ہے؟

میں نے کہا جی کہ آپ میرا کسی فرنچ یونیورسٹی میں ایڈمیشن کروا دیں۔

''ریسپشن'' پہ کھڑی لڑکا نما لڑکی کہنے لگی کہ فرانس میں تو انگلش میں ایجوکیشن نہیں ہوتی۔

میں نے کہا کہ یہ جو تین ماہ کا فرنچ کورس کیا ہے۔ کہنے لگی اب تین ماہ کی بنیاد پر آپ کو ایڈمیشن نہیں مل سکتا۔ میرا مشورہ ہے کہ پہلے بی اے، بی ایس سی کریں کم از کم اور ساتھ ایک سال کا فرنچ کورس۔

میں بس تھوڑی دیر خاموشی سے اسے تکتا رہا اور پھر

داغ وارفتہ کو ہم آج ترے کوچے سے
اس طرح کھینچ کے لائے ہیں کہ جی جانتا ہے

خیر یہ بات میں نے کسی کو نہیں بتائی۔ وہ کہتے ہیں نا ''بدسے بدنام بُرا''

اب میں نے کہنا شروع کر دیا کہ ہائیر ایجوکیشن پاکستان میں رہ کر ہی کرنی ہے۔ لاہور یا اسلام آباد جاؤں گا۔ بلکہ اسلام آباد ہی جاؤں گا، اپنے دوست محمد علی کے پاس جو نمل یونیورسٹی سے ایم اے انگلش کر رہا ہے۔ اس نے مجھے فون پر بتایا کہ ''بی اے'' ماڈرن لینگویجز میں ہو رہا ہے۔ اس نے کہا، پر ہے چار سال کا۔

میں نے کہا، یار چار سال میں تو بندہ انجینئر یا ڈاکٹر بن جاتا ہے۔ یہ چار سال میں میں صرف بی اے کروں گا۔ کہنے لگا یار دنیا میں انجینئر اور ڈاکٹری کے شعبے ہی نہیں ہیں صرف، اور باہر کے ممالک کے سٹوڈنٹس تو جانے کس کس شعبے میں کیا کیا کر رہے ہیں۔ میں نے کہا یعنی

''اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا''

مسئلہ چار سال کا نہیں تھا مسئلہ تو یہ تھا کہ میں یعنی چار سال پاکستان ہی رہوں گا۔ ''خیر'' بی اے'' ان ماڈرن لینگویجز سننے میں بھی ذرا کمال کا ہی لگتا تھا۔ بس میں نے پکا ارادہ کر لیا کہ کرنا ہے تو ''بیچلر ان ماڈرن لینگویجز'' اور محمد علی کو کہہ دیا کہ داخلہ نہ ہاتھ سے جائے۔ اس نے کہا کہ مسئلہ ہی کوئی نہیں داخلہ ہاتھ سے نہیں جانے دیں گے۔ داخلہ ہاتھ سے کیا جانا تھا؟ ڈیٹ ہی ہاتھ سے نکل گئی۔ ڈیٹ وہ نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں، میرا مطلب کہ داخلے کی ڈیٹ ہی ہاتھ سے نکل گئی۔ ہوا یوں کہ محمد علی نے کہا کہ بس تو آ جا، اگلے ہفتے داخلہ ہو جائے گا۔ میں اپنے ساز و سامان سمیت اگلے ہفتے آ گیا۔ یونیورسٹی ہاسٹل کی طرف گیا تو جا بجا چینی دکھائی دیں، میں نے سوچا، کبھی امریکہ اور کبھی چین یہ یورپ کہاں رہ گیا ہے؟ خیر محمد علی کے پاس پہنچا۔ تو وہ اپنے دوست کے ساتھ کمپیوٹر کو خراب کرنے پہ تلا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی محمد علی کے دوست نے کہا کہ بھائی آپ یہ کمپیوٹر تو دیکھیں ٹھیک ہی نہیں ہو رہا۔ میں نے کہا کہ بھائی میں کمپیوٹروں والا نہیں علی کا دوست ہوں۔ خیر علی نے کہا، اوئے اسے بیٹھنے تو دے پہلے۔

میں نے کہا کہ پہلے سے کیا مطلب آپکا یعنی بعد میں میرے سے کام ہی کروانے ہیں؟ کہنے لگا کہ صفائی نہیں کرانی یار یہ کمپیوٹر تو دیکھو آواز ہی نہیں آ رہی۔

میں نے کہا کمپیوٹر تو مسئلہ ہی کوئی نہیں اگر آج کمپیوٹر ایجاد نہ ہوا ہوتا تو میں نے ہی کرنا تھا۔ اس کا دوست کہنے لگا کہ بس ٹھیک کر دیں۔ میں نے کہا یار ''بس'' میں ٹھیک نہیں کرتا، آپ نے کیا مجھے مکینک سمجھا ہوا ہے۔

محمد علی کے دوست نے محمد علی کو ایسے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو، او بھائی یہ دوست کہاں سے پکڑ کے لائے

ہو؟ میں نے بھی کمپیوٹر ٹھیک کرنے کے لئے ہر قسم کے نکے لگائے۔ بقول خالد مسعود

ہم نکا لگاتے ہیں تو نکا نہیں چلتا
اور تیر چلاتے ہیں تو اُکا نہیں چلتا
میرٹ پہ سو بار ٹرائی کیا تو جانا
یہاں میرٹ بھی تو نکا نہیں چلتا

پر آج ہمارا نکا چل گیا تھا وہ بھی نکا، وہ مجھے دیکھ کے حیران میں انہیں دیکھ کے پریشان، خیر محمد علی کے دوست نے فٹافٹ کمپیوٹر پہ گانا لگایا کہ ''اک پھل موتیے دا مار کے جگا سوہنیے'' اور مسلسل دو گھنٹے یہی گانا سنتا رہا اور جبراً سناتا رہا۔ رات کو اس کے ساتھ ٹہلنے باہر نکل پڑے مجھے کہنے لگا کہ اور کیا مصروفیات ہیں پڑھائی کے علاوہ آپ کی؟

میں نے کہا شاعری کرتا ہوں۔

چونک کے کہنے لگا اوئے یہ کیا کرتے ہیں آپ؟

میں نے کہا شاعری کا کہا ہے، یہ نہیں کہا کہ گندی باتیں کرتا ہوں جو آپ اتنا چونک گئے۔

کہنے لگا بہر حال کوئی اور مناسب سا شغل تلاش کریں۔

مجھے اب ہلکا سا غصہ چڑھ گیا۔ میں نے کہا، آپ انگلش میں ایم اے کر رہے ہیں؟

کہنے لگا، جی

میں نے کہا کہ فیصل آباد گھر بار چھوڑ کر صرف انگلش سیکھنے آ گئے آپ وہیں کوئی پانچ چھ ماہ کا کورس کر لیتے انگلش کا۔ فیس کتنی ہے آپ کی؟ کہنے لگے کہ کوئی ایک سمیسٹر کی آٹھ، نو ہزار۔

میں نے کہا، اتنے میں تو چائنا کی دو سائیکل آ جاتی ہیں۔ ایک خود چلاتی تھی ایک چھوٹے بھائی کو دیتے۔ پھر بھی جیب میں دو تین ہزار بچ ہی جانے تھے۔ ان پیسوں کی فیصل آباد میں انگلش کی ٹیوشن رکھتے۔ سائیکل پہ مزے پہ جاتے مزے سے آتے۔ زبان سیکھنے کے چکروں میں اسلام آباد ہی آ گئے۔ اگر زبان سیکھنے کا اتنا شوق تھا تو پھر امریکہ ہی چلے جاتے۔ یہ اسلام آباد ہے لندن شہر نہیں جہاں ہر کوئی انگلش میں بات کر رہا ہوگا اور آپ فر فر انگلش بولنا سیکھ جائیں گے۔ بس پھر اگلے دو تین دن اس نے میرے سے کوئی بات نہیں کی۔ میں نے بھی کہا کہ یہ بات ہے تو پھر کوئی بات نہیں۔

تین دن ہو چکے تھے مجھے آئے اور محمد علی مجھے صرف حوصلہ ہی دے رہا تھا کہ فکر نہ کر ہو جائے گا داخلہ، پر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ مجھے حوصلہ دیتے ہوئے وہ اپنے آپ کو حوصلہ دے رہا تھا کہ ہو ہی جائے گا داخلہ۔ چوتھے دن میں نے اسے کہا کہ یار صحیح صحیح بتا دال میں کیا کالا پیلا ہے۔

وہ کہنے لگا دال ہی کالی ہوگئی ہے ساری، میں نے کہا کہ میں سمجھا نہیں۔

کہنے لگا کہ ''اے کیڑا کوئی نوی گل اے''

میں نے کہا کہ پہلیاں نہ بجا۔ کہنے لگا کہ داخلے کا ٹائم نکل گیا۔

میں نے کہا تو نے تو کہا تھا کہ آ جا بس ہو جائے گا، کہنے لگا یار پتہ ہی نہیں چلا تیرے آنے پہ ہی پتہ کیا۔ میں نے کہا تو نے کیا کیا۔

ویسے اندر سے میں تھوڑا مطمئن بھی تھا، کیونکہ سارے کا سارا ذمہ محمد علی پہ آ گیا تھا۔ ورنہ فارم جمع ہو جاتے تو اتنے نمبروں پہ داخلہ کہاں سے ہونا تھا؟ محمد علی ایڈمنسٹریشن کو جتنا مرضی چیخ چیخ کے بتاتا کہ یہ بڑا اچھا مقرر ہے، پاکستان لیول کا پر انہوں نے صاف منہ پہ ہی کہہ دینا تھا کہ اتنے نمبروں پہ پاکستان لیول چھوڑ کر چاہے ''ورلڈ لیول'' کا مقرر ہی کیوں نہ آ جاتا ہم نے اس کو بھی ایڈمیشن نہیں دینا تھا۔ وہ تو میری عزت رہ گئی کہ ''ڈیٹ'' ہی گزر گئی۔ محمد علی میرے سے معذرت کرتا پھرے۔ اور میں بھی تھوڑا بہت موڈ میں پھروں کیونکہ ایسے موقعوں پے موڈ میں رہنا ہی اچھا ہوتا ہے ورنہ اس نے سمجھنا تھا کہ ادھر بھی دال میں کچھ کالا ہے۔

میں واپس فیصل آباد آ گیا اور ابا جی کو کہنے لگا کہ اپنا شہر اپنا ہی ہے۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اپنے عظیم ادارے جی سی یونیورسٹی سے ہی ہائیر ایجوکیشن میرا مطلب ہے کہ ایجوکیشن پوری کرنی ہے اور پھر ہائیر ایجوکیشن کے لیے یورپ روانہ ہونا ہے؟

اگلے دن میں جی سی یونیورسٹی اپنی تمام ڈگریوں سمیت یعنی تعلیمی اور تقریری معرکوں کی ڈگریاں لے کر پہنچ گیا۔ تعلیمی ڈگریوں سے تو معمہ حل نہیں ہونے والا تھا۔ اس لیے سید ھا ڈرامیٹک سوسائٹی کے انچارج علی عثمان صاحب کے پاس پہنچا۔ ان کو اپنی تمام تقاریری اسناد دکھائیں۔

ساری اسناد دیکھ کر کہنے لگے کہ آپ نے انٹر میڈیٹ کا امتحان پاس کر لیا ہے؟ میں نے ڈرتے ہوئے کہا جی ہو گیا۔

کہنے لگے وہ بھی سند ان کے ساتھ لگا دیں اور سنائیں تقریر۔ خیر سنا دی تقریر، فوری اٹھے اور مجھے اپنے ڈیپارٹمنٹ سے باہر لے آئے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ مجھے یونیورسٹی گیٹ کے باہر چھوڑنے جا رہے ہیں۔ اور ''گارڈوں'' کو تاکید مزید بھی کر دیں گے کہ دوبارہ یہ سٹوڈنٹ اندر نہ داخل ہونے پائے۔ لیکن شاید انہیں رحم آ گیا اور انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ مجھے وہ ایک اور ڈیپارٹمنٹ میں لے گئے اور وہاں میرا فارم جمع کروایا۔ یوں میری ہائیر ایجوکیشن شروع ہو گئی۔

عنبرین صلاح الدین/لاہور

تم جو چاہو تو رُک بھی سکتا ہے
ورنہ کس سے رُکا ہے آدھا دن

بام سے ڈھل چکا ہے آدھا دن
کس سے ملنے چلا ہے آدھا دن
تم جو چاہو تو رُک بھی سکتا ہے
ورنہ کس سے رُکا ہے آدھا دن
جھانکتی شام کے کنارے پر
مجھ سے پھر لڑ پڑا ہے آدھا دن
اُس نے دیکھا جہاں پلٹ کے مجھے
بس وہیں رُک گیا ہے آدھا دن
آس کی آہٹیں جگائے ہوئے
کھڑکیوں میں سجا ہے آدھا دن
دھوپ کی ریشمیں طنابوں پر
کس طرح ٹوٹتا ہے آدھا دن
پڑ رہی ہو گی برف وادی میں
آنکھ میں جم گیا ہے آدھا دن
تیرگی کا لباس اوڑھے ہوئے
میرے اندر چھپا ہے آدھا دن
عنبرین ایک ہے، بکھیڑے سو
اور گزر بھی گیا ہے آدھا دن

گونجتی صداؤں کی ہر لپک قیامت ہے
راستوں کو مت کرنا بدگمان شہزادے
دیکھنا نہیں اچھا مڑ کے بے خیالی میں
ہوگئے یہاں پتھر سخت جان شہزادے
منتروں کی سرشاری، اب کہاں کی بےداری
ایک خود فراموشی ، ایک خواب سا طاری
اِک طلسم کی خودرو بیل بُنتی جاتی ہے
آہنی فصیلوں میں داستان شہزادے
ہوگئی ہیں زنگ آلود بیڑیاں بھی پاؤں کی
کیوں مری مسافت پر جنگلوں نے چھاؤں کی
رہگزر نہیں کھلتی اُن محل سراؤں کی
ختم کیوں نہیں ہوتا امتحان شہزادے
خواب سا پگھلتی ہوں، آئنوں سا کھلتی ہوں
ریگزارِ ساحل پر عکس عکس ملتی ہوں
دھڑکنیں سمٹتی ہیں اور کُھلتے جاتے ہیں
سانس کے سفینوں میں، بادبان شہزادے
اِک ہزار راتوں تک کس طرح سُنائی ہے،
میرے پاس شہزادے ایک ہی کہانی ہے
اور اس کہانی کے حرفِ اوّلیں میں ہے،
طائرِ یقیں میں ہے، میری جان شہزادے!

یوں ہر اک بوند کا سیماب بدن جم جائے
صحنِ برفاب میں بارش کا سخن جم جائے
تشنگی ایسی بندھی ہے ترے رستے پہ، اگر
آنکھ جھپکے تو وہیں اُس کی تھکن جم جائے
درِ آئندہ کے زنگار پہ ضوءِ مہتاب
اِک ذرا درز ملے اور کرن جم جائے
یوں مجھے دیکھے، پلٹ جائے وہ بے تاب نظر
تیر کھنچ جائے، پسِ چشم چبھن جم جائے
تُو خفا ہو تو زمینوں کی طنابیں اُکھڑیں
آسماں تک ترے ماتھے کی شکن جم جائے
عکس رک جائے ترا آنکھ کے آئینے پر
حلقۂ آب میں شفاف گگن جم جائے
پیکرِ خواب میں ڈھل جائے فسونِ وحشت
بام در بامِ سرِ شام گہن جم جائے

رستہ روکتی خاموشی نے کون سی بات سُنانی ہے
رات کی آنکھیں جان رہی ہیں، کس کے پاس کہانی ہے
آنکھ نے وحشت اوڑھی ہے یا منظر میں حیرانی ہے
دشت نے دامن جھاڑ کے پوچھا، اب کیسی ویرانی ہے
منظر ہے کھڑکی کے اندر یا ہے کھڑکی سے باہر
گردوں کی گیرائی ہے یا خاک نے چادر تانی ہے
کوندے سے لپکے پڑتے ہیں چٹکی بھر نیلاہٹ سے!
تاروں میں منظر کُھلنے سے پہلے کی حیرانی ہے
سارے سنگِ میل بھی منزل ہو سکتے ہیں، بھید کُھلا
ہاتھوں کی ریکھاؤں میں ہر منزل ایک نشانی ہے
آپ کہیں تو تین زمانے ایک ہی لہر میں بہہ نکلیں
آپ کہیں تو ساری باتوں میں ایسی آسانی ہے
روز و شب کے بندھن کھول کے وقت کا دریا چل نکلے
آپ کہیں تو دانائی ہے، ہم کہہ دیں، نادانی ہے
رات کی چادر تہہ ہونے تک، دُھوپ کا جادو کُھلنے تک
دروازے کے بند کواڑوں نے اِک بات چھپانی ہے
جتنے پل تک رقص کریں گی کرنیں برف کی قاشوں پر
کہساروں کے دامن میں بھی تب تک ایک کہانی ہے

اسیرِ خواب نئی جستجو کے در کھولیں
ہوا پہ ہاتھ رکھیں اور اپنے پر کھولیں
سمیٹے اپنے سرابوں میں بارشوں کا جمال
کہاں کا قصد ہے، یہ راز خوش نظر کھولیں
اُسے بھلانے کی پھر سے کریں نئی سازش
چلو کہ آج کوئی نامۂ دگر کھولیں
اُلجھتی جاتی ہیں گرہیں ادھورے لفظوں کی
ہم اپنی باتوں کے سارے 'اگر مگر' کھولیں

انیس احمد/لاہور

ہر پل اپنے آپ سے بھاگے رہتے ہیں
سو جائیں تو خواب میں جاگے رہتے ہیں

عشق، محبت، خواب، زمانہ، پتھر، پھول ہوا
سب سندیسے تم سے کرتا ہوں موصول، ہوا
میں تو صلح کرانا چاہوں آگ اور پانی میں
لیکن رستہ روک رہی ہے مٹی، دھول، ہوا
مٹی، آگ اور پانی مجھ سے نالاں رہتے ہیں
تیرے ساتھ نبھائی جیسے نامعقول، ہوا
جو بھی زندہ رہنا چاہیں زندہ رہتے ہیں
بن تیرے میں مر جاؤں گا، تیری بھول ہوا
بے گھر دیکھ کے تن میں رکھا اپنوں کی صورت
اور ہے میری خاک اُڑانے میں مشغول ہوا
آلودہ ماحول میں تیرے ساتھ مریں گے سب
تیری بات ہے کتنی سچی اور معقول، ہوا
زندہ رکھنے کا مجھ کو احسان جتاتی ہے
ہے میرے اک سانس برابر یہ مجہول ہوا
میں افلاک کے در پر دستک دے کر آیا ہوں
تو نے دیکھا ہے دنیا کا ارض و طول ہوا
قتل و غارت ناانصافی ہر سو دنیا میں
تم کو اس سے کیا لینا تو جھولا جھول ہوا

من کے اندر سے جو نکلی خاموشی
دنیا نے پھر دیکھی میری خاموشی
اپنے آپ سے نکلوں تو کچھ بولوں میں
چپ رہتا ہوں دیکھ لے اپنی خاموشی
حیرانی سے دیکھا اپنے کمرے میں
کاغذ، قلم، کتابیں، سردی، خاموشی
پانی نے بھی چپ رہنا ہے سیکھ لیا
دریاؤں میں بہتی دیکھی خاموشی
جگنو، تارے، چاند، ہوا، سناٹے سے
ہونٹ ہلا کر میں نے توڑی خاموشی
میرا ساتھ نبھانے کا ہے عہد کیا
چھپن برسوں سے ہے ساتھی خاموشی
روشن دان میں تنکے جوڑ کے چڑیا نے
توڑی میرے من میں بیٹھی خاموشی
کیا بولوں گا دنیا کے سناٹے میں
میں نے سوچا ہے بہتر ہی خاموشی
سارا عالم دل کی باتیں کرتا ہے
عالم کی ہم راز ہے میری خاموشی

ہر پل اپنے آپ سے بھاگے رہتے ہیں
سو جائیں تو خواب میں جاگے رہتے ہیں
ہر مشکل میں پیچھے رہنے والے لوگ
جب اعزاز ملے تو آگے رہتے ہیں
اپنے گرد و پیش پہ کیا تنقید کروں
اُلجھے میری سوچ کے دھاگے رہتے ہیں
بھیک مقدر بن جائے ان لوگوں کا
جن کے ہاتھ ہمیشہ آگے رہتے ہیں
دنیاداری کی چاہت میں دنیادار
اپنی دنیا آپ تیاگے رہتے ہیں

صحرا کے سفر میں کوئی سایہ ہی نہیں تھا
میں زادِ سفر ساتھ میں لایا ہی نہیں تھا
قاتل کو سزا ملتی بھلا کیسے، کیے کی
دینے کو گواہی کوئی آیا ہی نہیں تھا
ہر سمت میں آواز تھی آسودہ لبوں کی
بھوکے نے تو کشکول اُٹھایا ہی نہیں تھا
میں تشنہ رہا جلتا رہا، اپنے بدن میں
اک ابر میری ذات پہ چھایا ہی نہیں تھا
ووٹوں کے بھکاری نے بس اک ووٹ کی خاطر
پگڑی کو زمیں پر سے اُٹھایا ہی نہیں تھا
اک عمر کٹی تب مجھے معلوم ہوا ہے
میں جیسے زمیں زادوں میں آیا ہی نہیں تھا

ہیولا تھا اندھیرے میں دکھائی کس طرح دیتا
مری مشکل کا حل مجھ کو سجھائی کس طرح دیتا
وہ جس نے مالِ ناحق سے تجوری اپنی بھر لی تھی
تو پھر وہ شخص لٹنے پر دہائی کس طرح دیتا
مرے اندر کا انساں جانتا تھا میرے جرموں کو
وہ میری بے گناہی کی صفائی کس طرح دیتا
بڑی آسودگی چھائی ہوئی تھی میرے چہرے پر
مرے اندر کا سناٹا سنائی کس طرح دیتا
انیس احمد نے جب خود ہی سزا تجویز کر ڈالی
تو پھر اپنے ہی مجرم کو رہائی کس طرح دیتا

مبشر سعید/ملتان

کوئی دریا ہے اُس کی آنکھوں میں　　میں کنارے سے دیکھ سکتا ہوں

یہ دور، جس میں انسان آوازوں کے دریا میں شانوں تک غرق ہے، زندہ رہنے میں رائگانی ہی رائگانی دکھائی دیتی ہے اور ایک زرد اُداسی کھیتوں کھلیانوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس دور میں مبشر سعید خوابوں کا زادِ سفر لیے ہجر کی رات کو دیے کی لو میں باندھے، جادۂ غزل پر گرمِ سفر ہے۔ وہ لفظ کی حرمت کو قیمت، زر سے نہیں ناپتا۔ اُس کے اندر کا جہاں باہر کی خزاں سے محفوظ ہے۔ یہاں پرندے صاحبِ کشف ہیں اور قریۂ سبز سے آتی ہوئی پرکیف ہوا اپنا جادو جگا رہی ہے۔ فن، مبشر سعید کے نزدیک خود فنکار کے عالم وجد سے اظہار میں آنے کا نام ہے اور اس کا ثبوت اُس نے اپنی غزل میں دیا ہے۔ جو اُس کی قلبی کیفیات کا آئینہ ہے۔ (خورشید رضوی)

میں نے دیکھا ہے اُس کی آنکھوں میں
کوئی رہتا ہے اُس کی آنکھوں میں

سب کی آنکھوں سے حل نہیں ہوتا
کیا معمہ ہے اُس کی آنکھوں میں؟

آنکھ ٹکتی نہیں ہے دیکھے سے
وہ اُجالا ہے اُس کی آنکھوں میں

میں کنارے سے دیکھ سکتا ہوں
کوئی دریا ہے اُس کی آنکھوں میں

لوگ مرتے ہیں اُس کی آنکھوں پر
کچھ تو ایسا ہے اُس کی آنکھوں میں

وہ جو منزل کی اور جاتا ہے
کوئی رستا ہے اُس کی آنکھوں میں

حُسن خوبانِ جملہ عالم کا
سمٹ آیا ہے اُس کی آنکھوں میں

وہ سمندر مثال ہے، تب ہی
چاند ڈوبا ہے اُس کی آنکھوں میں

صبح ہونے کا خوش نما منظر
بھیگا بھیگا ہے اُس کی آنکھوں میں

سب لگے ہیں تلاش کرنے میں
کیا خزانہ ہے اُس کی آنکھوں میں؟

حُسن آدھا ہے مسکراہٹ میں
اور، پورا ہے اُس کی آنکھوں میں

رات، زُلفوں میں ڈوب جاتی ہے
دن نکلتا ہے اُس کی آنکھوں میں

یہ مبشر بھی دھیان جینے کا
بھول آیا ہے اُس کی آنکھوں میں

شام کی زرد اُداسی میں بٹھاؤں تجھ کو
زندگی! آ کبھی سینے سے لگاؤں تجھ کو

صاحبِ ہوش کو مدہوش بنانے کے لیے
آیتِ حُسن پڑھوں، دیکھتا جاؤں تجھ کو

تو نہیں مانتا مٹی کا دھواں ہو جانا
تو ابھی رقص کروں، ہو کے دکھاؤں تجھ کو؟

کر لیا ایک محبت پہ گزارا میں نے
چاہتا تھا کہ میں پورا بھی تو آؤں تجھ کو

اب مرا عشق دھمالوں سے کہیں آگے ہے
اب ضروری ہے کہ میں وجد میں لاؤں تجھ کو

اس نے اک بار محبت میں کہا مجھ سے سعیدؔ
عین ممکن ہے کہ میں یاد نہ آؤں تجھ کو

زرد موسم کی اذیت بھی اُٹھانے کا نہیں
میں درختوں کی جگہ خود کو لگانے کا نہیں

اب ترے ساتھ تعلق کی گزرگاہوں پر
وقت مشکل ہے، مگر ہاتھ چھڑانے کا نہیں

قریۂ سبز سے آتی ہوئی پرکیف ہوا
طاق پر رکھا مرا دیپ بجھانے کا نہیں

چل رہا تھا تو سبھی لوگ مرے بازو تھے
گر پڑا ہوں تو کوئی ہاتھ بڑھانے کا نہیں

صبر کا غازہ مرے عشق کی زینت ٹھہرا
سو، میں آنکھوں سے کوئی اشک بہانے کا نہیں

مجھ کو یہ میر تقی میر بتاتے ہیں سعیدؔ
عشق کرنا ہے مگر جان سے جانے کا نہیں

دل نے روکا تھا مگر چھوڑ آیا
میں محبت کا نگر چھوڑ آیا

خواب تو زادِ سفر ہوتے ہیں
اور میں زادِ سفر چھوڑ آیا

خود کو لے آیا ہوں میں اُس منظر سے
اور وہاں دیدۂ تر چھوڑ آیا

لو بچاتا تو یہ دن کب آتے
رات کی تیغ پہ سر چھوڑ آیا

ایک دہلیز پہ کچھ پھول دھرے
اک دریچے میں سحر چھوڑ آیا

عرفان اللہ عرفان/ظفروال

میرے کمرے میں کوئی آیا نہیں بعد مرے
گرد آلود سی تصویر سے اندازہ کیا

یہ مرے چارسو اک تماشا لگے
عالم رنگ و بو اک تماشا لگے
دیکھ چاروں طرف اک تماشا لگا
چاہتا تھا نہ تو اک تماشا لگے
پھوٹے زخم جگر اور بہے آنکھ سے
تازہ تازہ لہو اک تماشا لگے
رنگ اُڑنا مناسب ہے میخوار کا
ٹوٹنے سے سبو اک تماشا لگے
درحقیقت یہ کوئی تماشا نہیں
جو تجھے ہوبہو اک تماشا لگے
اپنے آشفتگاں کی خبر لینے آ
یا ترے روبرو اک تماشا لگے
جا کے اللہ کے گھر میں منائیں اسے
آج کر کے وضو اک تماشا لگے
مانگنا رزق جا کر تیرے نام کا
دربدر کوبکو اک تماشا لگے
مٹی زرخیز ہو یا نہ ہو دشت کی
بہر ذوق نمو اک تماشا لگے

ٹوٹتے خواب کی تعبیر سے اندازہ کیا
میں نے شاید ذرا تاخیر سے اندازہ کیا
دونوں جانب سے مسلمان تھے مرنے والے
آپ نے نعرۂ تکبیر سے اندازہ کیا
میرے پرکھوں کا مکاں مائل مسماری ہے
جس میں ٹوٹتے شمشیر سے اندازہ کیا
میرے کمرے میں کوئی آیا نہیں بعد میرے
گرد آلود سی تصویر سے اندازہ کیا
جھوٹ کے پاؤں بھی ہوتے ہیں اگر تو بولے
آج میں نے تری تقریر سے اندازہ کیا
آپ جادو سے بنا لیتے ہیں مٹی سونا
آپ کی پھیلی جاگیر سے اندازہ کیا
آپ تو اپنی خوشی سے ہیں غلام ابن غلام
آپ کی قیمتی زنجیر سے اندازہ کیا

سحر ہونے کو ہے ہائے مجھے کچھ شعر کہنے ہیں
کوئی مضمون مل جائے مجھے کچھ شعر کہنے ہیں
مجھے اس سلسلۂ عشق کو آگے بڑھانا ہے
نہیں جو یار کہہ پائے مجھے کچھ شعر کہنے ہیں
تری زُلفیں ترے چہرے لب و رُخسار پر تیرے
اگر تو جلوہ فرمائے مجھے کچھ شعر کہنے ہیں
مجھے اُکسا رہا ہے شاعری پر یہ حسیں موسم
درختوں کے گھنے سائے مجھے کچھ شعر کہنے ہیں
کہاں گم ہو گیا ہوں وادئ حیرت کی وسعت میں
کوئی میری خبر لائے مجھے کچھ شعر کہنے ہیں
دل اب یہ چاہتا ہے تم مجھے اب چھوڑ دو تنہا
تو کیا ہے آپ کی رائے مجھے کچھ شعر کہنے ہیں
کسی کے یاد آنے سے مری تنہائی بٹتی ہے
کوئی اب یاد نہ آئے مجھے کچھ شعر کہنے ہیں

رکھتے اپنا خیال تھک گا میں
مجھ کو آ کر سنبھال تھک گیا میں
وقت کے بے کنار صحرا میں
ہو کے آخر نڈھال تھک گیا میں
میں ترے کام کا نہیں اے دوست
مجھ پہ ڈورے نہ ڈال تھک گیا میں
اب کہاں تک مقابلہ کروں میں
رنج و حزن و ملال تھک گیا میں
درمیاں اپنے فیصلہ ہو کوئی
یار سکہ اُچھال تھک گیا میں
ایک دو دن کی بات ہو تو ہو
گردشِ ماہ و سال تھک گیا میں

ترے دل میں میری محبت نہیں ہے
ہمیں اب تمہاری ضرورت نہیں ہے
زمانہ خریدار پھولوں کا سارا
محبت جہاں میں تجارت نہیں ہے
ہمیں دوستوں کی بغاوت نے مارا
ہمیں دشمنوں سے شکایت نہیں ہے
انھیں شور اچھا بھی لگتا ہو لیکن
ہمیں بولنے کی اجازت نہیں ہے
مگن اس قدر ہے وہ دنیا میں ساگر
ہمیں دیکھنے کی بھی فرصت نہیں ہے

صدام ساگر/گوجرانوالہ

علی جوشا/لاہور

یہ میرے عہد کی روداد ہے علی جوشا
مکیں مکین میں رہ کر بھی گھر تلاشتے ہیں

پرندے شام کو جیسے شجر تلاشتے ہیں
اُسی طرح سے شجر بال و پر تلاشتے ہیں
نا جانے کون سی ہجرت پہ دل ہے آمادہ
کوئی مقام بھی ہو ہم سفر تلاشتے ہیں
وہ ممکنات سے آگے نکل بھی سکتے ہیں
جو لامکان کے دیوار و در تلاشتے ہیں
کہاں گیا میرا بچپن کہاں جوانی گئی
ٹھہر اے گردشِ دوراں ٹھہر تلاشتے ہیں
یہ میرے عہد کی روداد ہے علی جوشا
مکیں مکان میں رہ کر بھی گھر تلاشتے ہیں

دل میں جو بات ہے وہ منہ پہ سنا سامنے آ
یوں مری پیٹھ پہ خنجر نہ چلا سامنے آ
میں کہ موسیٰ تو نہیں پھر بھی یہ خواہش ہے مری
پھر نیا طور بنا پردہ اُٹھا سامنے آ
حسب اور نسب کا طعنہ مجھے دینے والے
تجھ میں کیا گُن ہے مجھے یہ تو بتا سامنے آ
اتنا نفاق فراواں ہے کہ آئینہ بھی
مجھ سے کہتا ہے کہ یہ چہرہ ہٹا سامنے آ
جب نہ تسخیر ہوئی میری انا اے جوشا
شاہ نے تیغ بکف مجھ سے کہا سامنے آ

نظر کی راہ میں دل کے نگر میں آنے سے
ذرا نہ فرق پڑا فاصلے مٹانے سے
یہ تیرے ہجر کے تحفے میں رتجگے میرے
میں جی رہا ہوں مگر کٹ کے اس زمانے سے
منازل آپ قدم چومنے چلی آئیں
میں ڈر رہا تھا نئے راستے بنانے سے
یہ کائنات کہ جب عالم نمود میں تھا
میں اس کو دیکھ رہا ہوں اُسی زمانے سے
کمال فن کا یہ ہے معجزہ علی جوشا
لگیں ہیں مجھ کو قد آور بھی درمیانے سے

میں کر رہا تھا دلیلوں سے اُس کی بات پہ بات
وہ بے دلیل کہ لے آیا میری ذات پہ بات
شکست خوردہ اُتر آیا بدکلامی پر
سو میں نے ختم ہی کر دی خود اپنی مات پہ بات
ہمارا ذکر بھی لازم ہے تم پہ اہل جنوں
کہیں پہ جب بھی چلے عشق بے ثبات پہ بات
تھے اہل فکر مسخر کیے جنھوں نے نجوم
یہ اہلِ علم رہی ان کی معجزات پہ بات
ہمی تو جوشا ہیں تاریکیوں کی ضد کے چراغ
کہ جلنے لگتے ہیں ہوتی ہے جب بھی رات پہ بات

صدف مثال ہوں دریا نہ یوں سنبھال مجھے
کبھی وجود سے باہر ذرا نکال مجھے
وہ تیری یاد وہ بادہ کشی وہ تنہائی
اُسی مقام پہ لے آئے ماہ و سال مجھے
انا کے ساتھ یہ سر بھی اُتار پھینکا ہے
شکست خوردہ نہ سمجھے کہیں زوال مجھے
وفا کی راہ میں بدنام یوں ہوا ہوں کہ وہ
مری ہی دینے لگا بے وفا مثال مجھے
یہ میری ماں کی دعاؤں کا معجزہ ہے علی
کہ اس عروج پہ لایا ہے خود زوال مجھے

رنگ بکھرا نہیں ابھی مجھ میں
ہے کسی بات کی کمی مجھ میں
جب کہیں پر دھمال پڑتی ہے
رقص کرتا ہے آدمی مجھ میں
میں کراچی سا شہر ہوں شاید
روز مرتے ہیں آدمی مجھ میں
دور ہوتا گیا اندھیروں سے
یوں اُتر آئی روشنی مجھ میں
اک نظر کا کمال ہے یارو
لوٹ آئی ہے زندگی مجھ میں
عمران حفیظ/میانوالی

خالد مسعود/لاہور

تجسس رہا اُس سے مل کر ہمیشہ
مرے بارے میں اور کیا جانتا ہے

لوگوں میں کسی کو کبھی رُسوا نہیں کرتے
اُس شخص کی مجبوری کا سودا نہیں کرتے
بپھری ہوئی موجوں سے وہ ٹکرائیں گے کیسے
جو سامنے طوفان کے آیا نہیں کرتے
مانا کہ ہر اک سو ہے خدائی تو بتوں کی
پر بُت کو خدا ہم تو خدایا نہیں کرتے
محروم کوئی ہے تو اُسے حوصلہ بخشیں
یہ ناخدا کیسے ہیں کہ اتنا نہیں کرتے
فانی ہے یہ دنیا یہ تو مٹ جائے گی اک دن
مٹ جاتا ہو جس نے اُسے مانگا نہیں کرتے
آوازِ سگاں اس کو سمجھ کر ہی گزر جاؤ
الزامِ رقیباں پہ تو غوغا نہیں کرتے
ہو زُلف کا سایہ بھی اگر عنبریں یارو
پھر اور کسی سمت تو جایا نہیں کرتے
پہلو میں ستارے ہیں کئی پہلو میں ہیں چاند
اس کا بھی غرور اب تو خدایا نہیں کرتے
دل میں ہی چھپا رکھتے ہیں دُنیا کے بھی غم
ہم چرخ کی عظمت کبھی رُسوا نہیں کرتے
ہے نظرِ کرم کوئی وگرنہ تو یہاں پر
احسان کریں جس پہ وہ اچھا نہیں کرتے
دل اُن کا چرا لینا بڑی بات ہے یارو
گل دستِ حنائی کو بھی بخشا نہیں کرتے
بے چین نظر کرتی ہے اُس شوخ بدن کو
بے باکی سے یوں حُسن کو میلا نہیں کرتے
رُتبے ہیں سو اُن کے مگر شان ہے کچھ اور
جو حرفِ شکایت پہ زباں وا نہیں کرتے
اخلاص کے بندوں کی تو تکریم ہے واجب
ملتے کبھی اُن سے بھی جو آیا نہیں کرتے
مے خانوں کی ہو خیر سلامت وہ جوانی
جو شیریں لبوں سے کبھی شکوہ نہیں کرتے
حاکم کو ہوسِ زر کی کیے جاتی ہے اندھا
نادار یہاں جینے کو کیا کیا نہیں کرتے
جی جاں سے فدا اُس گلِ رعنا پہ ہے یہ دل
جو ایسے فدا دل یہاں اپنا نہیں کرتے
مسعود نظر رکھتے ہیں ناکامی پہ ہم تو
حاصل کا کبھی شہر میں چرچا نہیں کرتے

مناظر سے فطرت کے چاہت ہوئی ہے
کہ خالق سے از حد محبت ہوئی ہے
چڑھے سورجوں کی وہ دیکھی ہے پوجا
کہ اب ہر پجاری سے نفرت ہوئی ہے
حیا کی رمق اب ہے چہروں پہ مفقود
سومت دیکھنے کی اب عادت ہوئی ہے
تمہیں چوم لیں گے اگر پاس آئے
ہمیں پھر نہ کہنا کہ بدعت ہوئی ہے
مری دید نے بخشی زیبائش اُس کو
زیارت سراپے کی زینت ہوئی ہے
مجھے زندگی کیوں رُلاتی ہے اتنا
تمنا بھی اب تیری رُخصت ہوئی ہے
نہ ملنے کی تنبیہ کو آ رہے ہیں
یہ اک اور ملنے کی صورت ہوئی ہے
وہ پُرسش کو آئے کہوں اور کیا میں
بحال اُن کے دیکھے سے صحت ہوئی ہے
اُسے زندگی کے معانی ملے ہیں
غریبوں سے جس کو محبت ہوئی ہے

وہ صاحب عطا ہے عطا جانتا ہے
دُعا کا ہے بندہ دعا جانتا ہے
نہیں یاد کچھ بھی محبت میں تیری
یہ بندہ وفا کا وفا جانتا ہے
مقدم تمہیں ہو تمہیں محترم ہو
مرا دل یا میرا خدا جانتا ہے
تجسس رہا اُس سے مل کر ہمیشہ
مرے بارے میں اور کیا جانتا ہے
فقط اتنا مسعود ہم جانتے ہیں
وہ ہنسنے کی غم میں ادا جانتا ہے

اُدھر وہ چاند لبِ بام جو ذرا چمکے
اِدھر نصیب مرا اُس سے ماورا چمکے
وہ سات رنگ کی تاروں بھری ردا چمکے
اُسی طرح کی ترے رُخ پہ ہے حیا چمکے
ترے محافظ و دربان ہیں ترے ناخن
کہ خار پھولوں کے جسموں پہ ہیں سدا چمکے
چمکتے تاروں کی پڑنے لگی ہے ماند چمک
ستارے تیری وفا کے لبوں پہ کیا چمکے

افسانہ

بیٹی جیسی گڑیا

اگنازیوسلون/ستار طاہر، آسٹریا

بیٹی کی فرمائش آج بھی پوری ہوتی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

کئی روز سے وہ جب گھر سے روزگار کی تلاش میں نکلتا تو اس کی پوری کوشش ہوتی کہ کسی طرح اس کی مڈبھیڑ اپنی پانچ برس کی بیٹی سے نہ ہو جائے۔ بہت دن پہلے اس نے اپنی بیٹی سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کے لئے ایک ایسی خوبصورت گڑیا خرید کر لائے گا جو اس کی طرح خوبصورت ہوگی۔ معصوم بچی نے پوچھا تھا۔

''ابو میں خوبصورت ہوں''

''ہاں بیٹے تم بہت خوبصورت ہو''

حالانکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ اس کی بیٹی خاصی بدصورت تھی۔ آنکھیں بہت چھوٹی' ناک بہت پھیلا ہوا اور کان بڑے' ہونٹ موٹے اور ٹیڑھے۔ تھوڑی نیچے کو جھکی ہوئی' ہاتھ پاؤں بھی ایسے ہی تھے۔ رنگ بھی صاف نہیں تھا۔ اس کے ذہن میں بچی کی پیدائش کے بعد کئی بار یہ خیال آیا تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی بیٹی کی بدصورتی کم ہو جائے گی' لیکن معاملہ اس کے الٹ ہوا اور وہ جوں جوں بڑی ہوئی اس کی بدصورتی نمایاں ہوتی چلی گئی۔ اس نے اپنی بیوی کو سمجھا دیا تھا کہ وہ کبھی بیٹی کو یہ احساس نہ ہونے دے کہ وہ بدصورت ہے۔ بلکہ اس کی تربیت ایسے انداز میں کرے کہ اس کے ذہن میں کبھی یہ احساس پیدا نہ ہو کہ وہ دوسروں کے مقابلے میں کمتر ہے۔ بیوی یہ ذمہ داری پوری طرح نباہ رہی تھی۔ برے دن آتے ہیں تو پوچھ کر نہیں آتے...... وہ جس فیکٹری میں کام کرتا تھا ایک تو وہ پہلے ہی خسارے میں جا رہی تھی۔ پھر اسے آگ لگ گئی۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ فیکٹری کے مالک نے جان بوجھ کر آگ لگوائی تھی۔ تاکہ ایک تو بیمہ کی بھاری رقم وصول کر سکے اور خسارے کا کام چھوڑ کر کوئی نیا کام کرے اور مزدوروں سے بھی جان چھوٹ جائے۔ کئی مہینوں سے وہ بے کار تھا۔ جو چار پیسے برے دنوں کے لئے بچائے تھے وہ بھی ختم ہو چکے تھے۔ اب حالات ایسے رخ پر آگئے تھے کہ وہ کوشش کرتا کہ اسے روزانہ کوئی کام مل جائے تاکہ جب شام کو گھر آئے تو اس کی جیت میں کچھ پیسے ہوں اور ہاتھ میں کھانے پینے' روز مرہ کی ضرورتوں سے بھرا ہوا تھیلا۔ اکثر اسے کوئی کام نہ ملتا' پورے شہر میں بے روزگاری عام تھی اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ حالات کب تبدیل ہوں گے۔

ان حالات میں اس کی بیٹی نے گڑیا کی ضد شروع کر دی۔ وہ اب گلی محلے میں کھیلنے چلی جاتی تھی۔ اس کی ماں کو خیال تھا کہ ان کی بیٹی میں خاصا اعتماد پیدا ہو گیا ہے۔ ویسے بھی گلی محلے کے بچے بھی کوئی ایسے گلفام نہیں تھے کہ وہ ان کی بیٹی کی بدصورتی کا مذاق اڑاتے۔ ایک دن وہ گلی کی کسی لڑکی کے پاس ایک گڑیا دیکھ آئی۔ اب وہ بضد تھی کہ اسے بھی ایسی ہی گڑیا خرید کر دی جائے۔ وہ اور اس کی بیوی اپنی بیٹی کو اپنے برے حالات کے بارے میں کچھ بتانا نہیں چاہتے تھے۔ اور اگر بتاتے بھی تو شائد یہ بات ان کی بچی کی سمجھ میں نہ آتی۔ اس نے اپنی بیٹی کا دل رکھنے کے لئے ایک گڑیا...... خوبصورت گڑیا دینے کا وعدہ کر لیا۔ بیٹی جیسی خوبصورت گڑیا لا کر دینے والا جملہ اس کے منہ سے ایسے ہی نکل گیا تھا۔ لیکن بیٹی کا جواب سن کر اسے تعجب ہوا تھا ''ابو کیا میں خوبصورت ہوں''

اکثر جب وہ کام کی تلاش میں بھٹک رہا ہوتا تو یہ جملہ اس کے کانوں میں گونجنے لگتا'' کیا میری بیٹی کو معلوم ہو گیا ہے کہ وہ خوبصورت نہیں بلکہ بدشکل ہے؟'' وہ سوچتا...... اور کوئی جواب نہ دے پاتا۔ اصل میں وہ اس مسئلے پر قصداً سوچتا ہی نہیں تھا۔ یہ خیال تو خود بخود اس کے ذہن میں آ جاتا تھا۔

اس کی بیٹی کی ضد میں شدت پیدا ہوتی گئی۔ وہ روتی، ٹھنکتی اور کہتی مجھے گڑیا چاہیے...... مجھے گڑیا لا کر دو۔

ہر روز جھوٹا وعدہ کر کے تسلی دے کر وہ خود کو بھی خاصا پریشان کر رہا تھا۔ سوچتا وہ اسے کیوں بتا نہیں دیتا کہ میں ابھی اس کے لئے گڑیا نہیں خرید سکتا۔ لیکن یہ بتانے کی اس میں جرات کبھی پیدا نہ ہو سکی۔ جب وہ کام پر جانے لگتا تو وہ اس کے سر ہو جاتی۔ آج گڑیا لے کر آنا۔ خالی ہاتھ نہ آنا۔ اس نے بیوی سے مشورہ کیا اور صبح اپنی بیٹی کے جاگنے سے پہلے ہی روزی روزگار کی تلاش میں جانے لگا

تا کہ بیٹی سے جھوٹ نہ بولنا پڑے۔

اس روز اسے کئی دنوں کے بعد کام مل گیا۔ایک دوکاندار اپنی دکان کی توسیع اور مرمت کے بعد اسے نئے سرے سے ترتیب دے رہا تھا' اسے کچھ مزدوروں کی ضرورت تھی۔ دو دن اس نے وہاں کام کیا اور اچھے خاصے پیسے اسے مل گئے۔ جب دوسرے دن کام ختم ہونے کے بعد اسے اچھی خاصی رقم ادا کی گئی تو اس نے سوچا آج میں گڑیا خرید کرلے جاؤں گا۔

اس نے کھلونوں کی دکانوں پر ایک مناسب' اچھی گڑیا کی خوب جانچ پڑتال کی۔ ہر گڑیا جو اچھی تھی بہت مہنگی تھی کچھ گڑیاں تو ایسی بھی تھیں جو اتنی مہنگی تھیں کہ وہ اپنی پوری کمائی ادا کر کے بھی نہ خرید سکتا تھا۔ تین چار دکانوں پر مختلف قیمتوں کی گڑیاں دیکھنے کے بعد وہ ایک جگہ کھڑا ہو گیا۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اب کتنے دنوں کے بعد کام ملے گا ان پیسوں سے وہ چند دنوں کے لئے گھر میں راشن بھی ڈال لینا چاہتا تھا۔ تاکہ گھر میں فاقے کی نوبت نہ آئے۔ بہت حساب کتاب لگا کر اس نے آخری فیصلہ کرلیا۔ آٹھ یا دس روپے سے زیادہ قیمت کی گڑیا نہیں خرید سکتا تھا۔ اس کی بچی کو بھی گڑیا سے کہیں زیادہ خوراک کی ضرورت تھی' گڑیا کا کیا تھا' اچھے دن آنے پر' مستقل ملازمت ملنے پر وہ اسے پھر گڑیا خرید کردے سکتا تھا۔ اس نے جو گڑیا خریدی وہ معمولی تھی۔ پلاسٹک کی بنی ہوئی۔ بہر حال اس نے گڑیا خریدی' لفافے میں رکھی اور چل پڑا۔

گھر جانے سے پہلے اس نے ضروری سامان خریدا ایک بڑا تھیلا اس سامان سے تقریباً آدھا بھر گیا۔اس کے بعد وہ ٹرام میں سوار ہو کر گھر جلدی پہنچنا چاہتا تھا۔ ٹرام میں بہت رش تھا۔ کسی نے دھکا دیا تو بڑا تھیلا اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ ادھر ٹرام رکی اور لوگ اس کے تھیلے کو روندتے اترتے چڑھتے گئے۔ جب ٹرام چلی تو بڑی مشکل سے وہ اپنا تھیلا اٹھانے میں کامیاب ہوا۔

وہ گھر پہنچا...... سامان کا تھیلا دیکھ کر اس کی بیوی کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی۔

ایک ایک کرکے وہ چیزیں نکالنے لگی۔ بیٹی بھی پاس بیٹھی تھی وہ اپنی بیٹی کو اچانک گڑیا دے کر خوش کرنا چاہتا تھا۔ تھیلے کے آخر میں سارے سامان کے نیچے وہ گڑیا والا لفافہ تھا۔

''بوجھو تو میں کیا لایا ہوں''

''گڑیا' گڑیا'' وہ خوشی سے چیخنے لگی۔

اس نے لفافے سے گڑیا نکالی۔

پلاسٹک کی گڑیا سامان کے بوجھ اور لوگوں کے قدموں کے نیچے روندے جانے سے بالکل پچک گئی تھی۔ ہونٹ ٹیڑھے میڑھے اور موٹے ہوگئے تھے آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ ناک بوجھ سے پھیلی ہوئی تھی...... گڑیا کا وجود دوہرا تہرا ہو گیا تھا۔ وہ حیرت اور قدرے تاسف سے گڑیا کو دیکھنے لگا۔

اس کی بیٹی نے جلدی سے وہ گڑیا چھین لی......

اسے دیکھا پھر ہنسی' اس کی ہنسی بے ریا اور معصوم تھی......

''بالکل میرے جیسی ہے۔'' وہ بولی'' ابو شکریہ۔ آپ میرے جیسی خوبصورت گڑیا لائے۔''

اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا جو آنسو چھپانے کے لئے اٹھ کر جا رہی تھی۔

بازارِ جاں میں جنسِ تجارت ہیں اور بس
ہم ایک دوسرے کی ضرورت ہیں اور بس

روندی ہوئی اناؤں کا اک ڈھیر ہے حیات
ہم کشتگانِ اژدرِ غربت ہیں اور بس

زیبا تھی جن کو شانِ طرح دار کل تلک
آمادۂ شکست و ہزیمت ہیں اور بس

یہ شہر دوستوں سے تو خالی نہیں ہوا
لیکن وہ دوستی کی علامت ہیں اور بس

آسودگی کے لوگ سزاوار ہی نہیں
وقفِ حصارِ گردشِ قسمت ہیں اور بس

ہم، اہلِ زر کے جشنِ شب و روز کے لیے
مصروفِ کار زارِ مشقت ہیں اور بس

بٹتے رہیں گے حسب طلب فاتحین میں
ہم بے زبان مالِ غنیمت ہیں اور بس

سرور ارمان/ لاہور

فنِ تشہیر

ڈان سٹیپنز/ستار طاہر، آسٹریا

بچپن کی سرحدوں کو پھلانگنے والے نوجوان گدھے نے اپنی بات سے اپنے بوڑھے باپ کو چونکا دیا۔ ''کیا کہا تم نے! کیا ہو سکتا ہے'' بوڑھے گدھے نے پوچھا۔ ''باباجی مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میں یہ کر سکتا ہوں'' مگر یہ تو بتاؤ کہ تم کونسا کام کر سکتے ہو بیٹے؟'' بوڑھے گدھے نے پوچھا۔ ''اب میں شیر کی کھال پہن سکتا ہوں کوئی پہچان بھی نہ سکے گا۔ اس طرح ہم ان سب کو بے وقوف بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ہمیں ماضی کے تجربہ سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

''تمہیں اس گدھے کا حشر یاد نہیں جس نے شیر کی کھال پہن کر شیر بننے کی کوشش کی تھی۔'' بوڑھے گدھے نے کہا ''وہ احمق تھا۔'' نوجوان گدھے نے جوش سے کہا۔ ''ادھر اس نے ہینکنا شروع کیا ادھر لوگوں کو اس کی اصلیت کا پتہ چل گیا۔'' نوجوان گدھے نے شیر کی کھال میں اپنے آپ کو چھپا لیا۔ وہ شیر ہی نظر آ رہا تھا۔ کھال اوڑھ کر جوان گدھا بڑی شان سے ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ بوڑھے گدھے نے کہا۔

''اچھی کھال ہے۔ اب ذرا شیر کی طرح دھاڑ کر دکھاؤ۔'' نوجوان گدھے نے اپنا منہ کھولا مگر اس کے منہ سے جو آواز نکلی وہ ہینگنے کی نہ تھی بلکہ کسی طاقتور اور جوان شیر کے دہاڑنے کی آواز تھی۔ بوڑھا گدھا اتنا حیران ہوا کہ وہ زمین پر گر پڑا اور تقریباً آدھا منٹ تک آنکھیں جھپکتا رہا۔ ''واقعی تم دھاڑ رہے تھے''۔

''ہاں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ اصل چیز تشہیر ہوتی ہے، وہ چیز نہیں جس کی تشہیر کی جاتی ہے۔ میری دھاڑ اصل ہے اندر سے میں گدھا ہوں تو کسی کو کیا خبر!''

بوڑھے گدھے کی زبان کی نوک پر ایک بات آتے آتے رہ گئی۔ تھوتھا چنا باجے گھنا۔ مگر اس نے چپ رہنے ہی میں بہتری سمجھی اور پوچھنے لگا'' مگر میں حیران ہوں کہ تم نے سچ مچ شیر کی طرح دہاڑنا کس طرح سیکھ لیا''۔ ''نیا زمانہ نئے اطوار'' نوجوان گدھے نے اتراتے ہوئے کہا۔ ''میں ایک مدت سے شیروں کا معائنہ اور مطالعہ کر رہا ہوں اب تو کوئی شیر بھی میرے مقابلے میں دھاڑ کر نہیں دکھا سکتا۔''

''غرور کا سر نیچا'' بوڑھے گدھے کے دل میں یہ الفاظ گونجے اور اس بار ہمت کر کے وہ ان الفاظ کو زبان پر لے آیا۔

''بندر کیا جانے ادرک کا مزہ۔'' نوجوان گدھے نے اپنے بوڑھے باپ پر طنز کرتے ہوئے کہا۔

''میٹھی گھاس بھی بوڑھوں کے ٹوٹے ہوئے دانتوں کے نیچے جا کر کڑوی ہو جاتی ہے۔'' گھاس کے ذائقہ کا پتہ کھانے سے چلتا ہے بوڑھے گدھے نے کہا ''اب باتیں کم اور کام زیادہ دکھاؤ۔''

شیر کی کھال میں مگن اور اتراتا ہوا نوجوان گدھا قریبی گاؤں کی طرف چل پڑا۔ گاؤں کے باہر اسے ایک کتا دکھائی دیا۔ گدھے کو توقع تھی کہ کتا اسے شیر سمجھ کر بھاگ جائے گا مگر کتا بڑی بے نیازی سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا رہا۔

''تم بھاگے کیوں نہیں؟'' گدھے نے پوچھا۔

''میں بھلا کیوں بھاگتا۔'' کتے نے بڑی بے نیازی سے کہا۔ ''اگر تم دھاڑتے ہوئے یہاں آتے تو پھر میں یقیناً بھاگ اٹھتا'' پھر یہ کہ ''مجھے بھلا کیا علم کہ تم شیر کی کھال میں گدھے نہیں ہو۔ یہ ایک بار تو ایسا ہو چکا ہے۔ وہ گدھا جس نے شیر کی کھال اوڑھ رکھی تھی مجھے یاد ہے۔''

''یاد آیا'' گدھے نے کہا۔ ''مگر تمہیں پتہ چل جائے گا کہ میں کون ہوں'' یہ کہہ کر اس نے منہ کھولا اور دھاڑنے لگا۔

''واقعی تم شیر ہو'' یہ کہہ کر کتا دم دبا کر بھاگا۔

دو فرلانگ تک کتا بھاگتا چلا گیا۔ جب وہ تھک گیا تو ایک جگہ رک کر ستانے لگا پھر اپنے پنجے سے اپنے جسم کو کھجایا اور اپنے آپ سے کہنے لگا'' دھاڑ تو وہ شیر کی طرح تھا مگر وہ شیر نہیں تھا۔ گدھا تھا جو شیر کی کھال اوڑھے پھر رہا ہے۔ میں ابھی جا کر اپنے آقا کو خبر کرتا ہوں۔''

کتا تیزی سے بھاگتا ہوا اپنے مالک کے پاس پہنچا۔

''آقا! ایک احمق گدھا شیر کی کھال اوڑھے پھر رہا ہے۔ اپنی چھڑی اٹھایئے اور اس کی مرمت کر دیجئے۔''

''یہ تو میں کروں گا ہی'' کتے کے مالک نے کہا'' میں اس نا ہنجار کو خوب پیٹوں گا جو اتنی اوچھی اور باسی حرکت کے ساتھ لوگوں کو دھوکا دے رہا ہے۔''

"آقا مجھے آپ سے یہی امید تھی۔" کتے نے خوش ہو کر کہا۔

کتا اور اس کا مالک تھوڑی دور ہی گئے ہوں گے جب انہوں نے گدھے کو دیکھا' جو شیر کی کھال میں تھا اور غرا رہا تھا۔

کتے کے مالک نے کہا "گدھے کے بچے ابھی جب تم میری چھڑی کی ضرب سہو گے تو اپنی اصلیت جان جاؤ گے۔"

"میں اسے اپنے دانتوں سے نوچ لوں گا۔" کتے نے کہا۔

مرد چھڑی لئے آگے بڑھا۔ اس نے گدھے کو مارنے کے لئے چھڑی اوپر اٹھائی۔ گدھے نے منہ کھولا اور دھاڑنے لگا۔ شیر دھاڑا اور آگے بڑھ کر مرد کے بازو پر بھی دانت دے مارے۔ مرد خوف سے چیخا۔ چھڑی اس کے ہاتھ سے گری اور وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنے لگا۔ وہ ایک میل تک بھاگتا چلا گیا۔ کتا اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ جب وہ دم لینے کے لئے رکا تو کتے نے کہا۔ "آقا آپ کیوں بھاگ رہے تھے' وہ تو گدھا تھا۔"

"بکواس نہ کرو۔ وہ شیر تھا۔ شیر کی طرح دھاڑ رہا تھا' اس نے میرے بازو پر کاٹا بھی ہے۔ خاموش رہو۔ تم نے تو مجھے مروا ہی دیا تھا۔"

"مگر میرے آقا' آپ مجھے بات کرنے کی اجازت تو دیں' میں چند لفظوں میں ثابت کر سکتا ہوں کہ وہ شیر نہیں گدھا تھا۔"

"لفظ نہیں' دنیا میں عمل پر نظر رکھی جاتی ہے۔" یہ کہہ کر کتے کے مالک نے کتے کو پیٹنا شروع کر دیا۔

کبھی صحرا ترا لہجہ، کبھی بارش تری باتیں
کبھی ٹھنڈا ترا لہجہ کبھی آتش تری باتیں
یہی شیرینی و تلخی طبیعت سیر کرتی ہے
کبھی کڑوا ترا لہجہ کبھی کشمکش تری باتیں
نہیں کوئی طبیب دل ستم مائل ترے جیسا
کبھی پھایا ترا لہجہ کبھی سوزش تری باتیں
بھڑکتی بجھتی ہے پل پل چراغ زندگی کی لو
کبھی رسیا ترا لہجہ کبھی رنجش تری باتیں
متاع زیست ہے نینا یہی غربت یہی دولت
کبھی کاسہ ترا لہجہ کبھی بخشش تری باتیں

نینا عادل/ کراچی

سب کو یزید عصر کا چہرہ دکھائی دے
وہ روشنی کرو کہ اندھیرا دکھائی دے
بنجر زمین سے بھی محبت کرے کوئی
اور کچھ کو ارض پاک بھی صحرا دکھائی دے
اس شہر کے زوال کی بابت نہ مجھ سے پوچھ
ہر آدمی کمال ہی کرتا دکھائی دے
عہد خزاں میں تشنگی دید تو مٹے
ہر گل فروش "آپ" کو تکتا دکھائی دے
ہاں دوسرے کے خون کا پیاسا ہے جو یہاں
تحسین خود وہ پیار کا بھوکا دکھائی دے

مدثر تحسین/ چیچہ وطنی

اگست

یہی تھا موسم یہی رتیں تھیں
کہ جب یہاں پر
کسی قبیلے کے شب گزیدہ سفر کو آخر "زوال آیا"
اور ان کی ساری ہی خواہشوں کو
صداقتوں کو...... ریاضتوں کو
حقیقتوں کی سحر میں آخر "کمال" آیا
کمال بھی بے حساب آیا
...... پھر آج کے دن
کسی نے مجھ سے کہا یہ آ کر
سوال مجھ کو دیا یہ لا کر
تمہیں فقط یہ تلاشنا ہے
اسی "زوال و کمال" کی داستاں کے پیچھے
"زوال کیا تھا؟ کمال کیا تھا؟"
مجھے بھی آج سوچنا ہے
مجھے بھی آج دیکھنا ہے
تو میں نے سوچا
تو میں نے دیکھا
سفر کی ساری صعوبتوں کو
سفر کی ساری اذیتوں کو شمار کر کر کے میں نے دیکھا
سو بعد میں اس کے میں نے دیکھا
مسافروں کی ریاضتوں کے...... صداقتوں کے
سراغ سارے
اور ان کی منزل پہ جا بجا بکھرے داغ سارے
برہنہ سر اور سر برہنہ پا یہ سماج دیکھا
مسافران سفر گزیدہ کا "آج" دیکھا
پھر اس کے فوراً ہی بعد میں نے
جواب لکھنے کی آرزو کی
جواب کوئی نہ لکھ سکا میں
سوال کو ہی بدل دیا بس
سوال اب یوں لکھا تھا میں
"کمال کیا تھا؟...... زوال کیا ہے؟"

مدثر تحسین/ چیچہ وطنی

افسانہ

تہی داماں

صبا ممتاز بانو/لاہور

"زندگی اکیلے رہنے سے نہیں، کسی کے ساتھ سے حسین ہوتی ہے۔"

یہ مشہور فقرہ اس نے...... پہلی دفعہ نہیں سنا تھا یہ تو کئی لوگ اسے کہہ چکے تھے کہ زندگی کا مزہ اکیلے پن میں نہیں مگر جب یہ فقرہ اس نے کہا تو اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس طرح کے فقرے بول کر دراصل وہ اسے سمجھاتا تھا کہ "وہ اس سے شادی کرلے۔" اسے پتہ تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے بے شک ضرورت کے لبادے میں لپٹی ہوئی مگر تھی تو محبت، بقول اس کے دنیا کی کوئی عورت اسے اس طرح مطمئن نہیں کر سکی تھی وہ کہتا تھا کہ تم ان عورتوں میں سے ہو جن کے لیے مرد جنت کی حوروں کو ٹھکرا سکتا ہے۔ وہ عورت جسے مرد کے لیے تحفہ کیا گیا ہے وہ تم جیسی ہی ہوتی ہیں۔

اس کا اسے ان عورتوں جیسا کہنا بھی اپنی توہین لگتا تھا کہ وہ خود کو کسی جیسا نہیں سمجھتی تھی کہ وہ تو بس ایک تھی اس جیسی کوئی اور نہیں ہو سکتی تھی۔

یہ بات نہیں تھی کہ اسے تعریف اچھی نہیں لگتی تھی۔ تعریف کسے اچھی نہیں لگتی اور وہ بھی عورت کو۔ اگر کوئی عورت یہ کہتی ہے کہ اسے تعریف پسند نہیں تو وہ صریحاً جھوٹ بولتی ہے اس لیے کہ خود کو منفرد کہلوا سکے عام روایتی عورت سے الگ ساز کی حامل عورت۔ تعریف تو عورت کے سر پر ایسا چڑھ کر بولتی ہے کہ اس کے دماغ کو ہپناٹائز کر دیتی ہے۔ وہ سحر زدہ ہو کر بس بار بار تعریفی کلمات اپنی مداح سرائی اور داد دیتی ہوئی نگاہوں کو دماغ کی پردہ سکرین پر دہراتی رہتی ہے۔ تعریف کے بل پر عورت کو لوٹا جا سکتا ہے۔

اسے بھی تعریف اچھی لگتی تھی مگر اس تعریف کے بدلے وہ کسی کم تر بندے سے شادی نہیں کر سکتی تھی۔ پل دو پل کا ساتھ یا پھر کچھ گھنٹوں کا سفر یا پھر ایک رات کی بات یعنی رات گئی بات گئی...... ضرورتوں کی سولی پر چڑھنے کا مطلب یہ نہیں کہ خواہشوں کی سیج بھی اسی سولی پر سجائی جائے۔

وہ اسے سمجھاتا رہتا تھا کہ "عمر گزر رہی ہے۔ جلد شادی کرلو۔ وہ اس سے عمر میں بڑی تھی مگر وہ کہتا تھا کہ مجھے پروا نہیں۔ جب وہ یہ کہتا تھا کہ اسے پروا نہیں تو وہ زہر خندی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے اس پر طنز کرتی۔

"تم نہ تو تعلیم یافتہ ہو، نہ خوبصورت اور نہ تمہارے پاس دولت ہے۔"

"مجھے تم سے شادی کیوں کرنی چاہیے؟ کیا مجھے اپنے معیار سے اتنا نیچے گر جانا چاہیے۔"

"اس لیے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ بے انتہا محبت......" وہ ہر دفعہ اپنے دعوے پر اصرار کرتا اور وہ ہمیشہ کی طرح اس کے دعوے کا مذاق اڑاتی۔

محبت ایک لفظ ہے مگر اس ایک لفظ کو ثابت کرنے کے لیے کئی جتن کرنا پڑتے ہیں۔ بہت سے پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں...... رانجھا، مجنوں، فرہاد، پنوں، جیولٹ اپنی جھوباؤں کے لیے سب نے کشٹ کاٹے ہیں، تم کشٹ کاٹنا تو رہی بات آج تک میرے کسی کام نہیں آئے۔ اخلاقی، مالی کسی بھی لحاظ سے میری کوئی مدد نہیں کی۔ محبت کی ابتدا کیئر Care سے ہوتی ہے تمہاری محبت کی ابتدا بھی ضرورت ہے اور انتہا بھی ضرورت۔ تمہاری ضرورتوں کی دنیا تمہاری عمر سے زیادہ ہے۔ اس خانے کو ہمیشہ تم نے خواہش پر رکھا اور دیوار پر محبت لکھ دیا۔ چونا کی ہوئی دیوار پر رنگ و روغن سے محبت لکھ دینے سے کوری اینٹ پر کندہ ضرورت کو تم چھپا نہیں سکتے۔ بعض دفعہ ظاہری چیزیں نگاہوں سے اوجھل رہتی ہیں اور پس پردہ چیزیں واضح ہو جاتی ہیں۔

اس کی بات سن کر وہ سر پٹختا اور چلانے لگتا، "ہاں ہاں تمہیں کبھی میری محبت کا یقین نہیں آئے گا، تم ایک متکبر، خودسر اور خود پسند عورت ہو۔" وہ اس پر الزام تراشی شروع کر دیتا...... وہ اس کی محبت کے دعویٰ کو پرکھنے لگتی کیا سچ تھا؟...... کیا جھوٹ؟...... جھوٹ، اس کی محبت جھوٹ ہے۔ کتنے تکلیف دہ دن گزارے تھے اس نے جب اسے پیسوں کی ضرورت تھی انشورنس جمع کرانی تھی۔ گھر کے اخراجات تھے۔ گھر کی تعمیر کے لیے، داخلے کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی اور وہ تھا کہ محبت محبت کا راگ الاپ کر اپنا من ہلکا کر لیتا...... جیب ہلکی کرنے کو وہ تیار نہیں تھا۔

اس کا سبب وہ یہ قرار دیتا کہ اس کی جیب میں کچھ تھا ہی نہیں...... وہ تہی داماں تھا یہ وہ بھی جانتی تھی کہ وہ بقا کے دور سے گزر رہا ہے۔ "دیکھا، ایک دن میں Settle ہو جاؤں گا، تب میں نہ صرف تمہاری ضرورتیں پوری کروں گا بلکہ اپنی خواہش بھی...... اس کی تمنائیں کیا تھیں؟

"تمہارے بزنس میں تمہاری مدد، تمہیں ایک گاڑی کا تحفہ اور اور......" (اس سب کے بدلے میں سال میں ایک تحفہ کا ساتھ)

وہ ہنس دیتی کئی بار تو اس نے کہا تھا کہ میں نے تمہاری برتھ ڈے پر چاندی کا لاکٹ بننے دیا ہے، فلاں بوتیک سے سوٹ خریدنے چلیں گے، گھر کے لیے مچھلی کا ٹرالے کر دوں گا (جی بھر کھانا) بہن کی شادی پر مٹھائی کا ڈبہ...... اور اس دفعہ کے سیزن میں حاصل ہونے والی آمدنی میں سے سونے کا سیٹ، پتہ نہیں کتنے تڑپ کے لیے پھینکتا تھا وہ۔

اتنی ساری باتیں کرنے والا اس کی برتھ ڈے پر ایک معمولی سا کیک لے کر نہ آ سکا اس کی ہر بات جھوٹ تھی...... خود کو برتر ثابت کرنا، کبھی ناممکن ارادوں کا اظہار کرنا۔

وہ سب سمجھتی تھی، ثبوت وہ دے نہیں سکتا تھا کیونکہ ثبوت اس کے پاس تھا نہیں...... صاف گوئی سے اسے چڑ تھی...... صفائی کے لیے اس کے پاس تھا کچھ نہیں...... بزدل وہ انتہا کا تھا۔ اس میں خوبیاں بھی تھیں، مہمان نواز تھا، ملنسار تھا، باصلاحیت تھا، باشعور تھا مگر اس کی خامیاں اتنی شدید، اتنی بدصورت، اور اتنی کریہہ تھیں کہ لگتا تھا جیسے کراہت بن کر اس کے چہرے پر چپک گئی ہوں، تبھی تو اس کے چہرے پر ٹپکتی تھیں۔

وہ پہاڑوں جیسے دعوے کرتا اور زمین پر ماتھا ٹیک دیتا...... آسماں سے برستے اولے جیسے زمین پر گر کر اپنا وجود کھو دیتے ہیں۔ مگر شرمندگی اس کی نگاہوں میں پھر بھی رتی بھر نہیں ہوتی تھی۔ دعوے کرنے والے اکثر ڈھیٹ ہوا کرتے ہیں کیونکہ انسان تو سراپا کوشش ہے لگن ہے، سعی ہے، محبت ہے، انسان کے اپنے اختیار میں جب کچھ بھی نہیں تو پھر دعوے کیوں......؟ ہم نے یہ کہہ دیا، ہم نے وہ کر دیا ہم یہ کریں گے، ہم وہ کریں گے...... خدا کی ہم مرتبگی کا شعار بھلا انسان کو کہاں زیب دیتا ہے؟

پہلے وہ اس کی باتیں سن کر جرح کرتی تھی۔ پھر اس کی عملی کجی کو دیکھ کر طنز کرنے لگی اور پھر آہستہ آہستہ اس نے چپ سادھ لی۔

ایک چھوٹے شخص سے کیا ٹکرانا...... وہ بھی پرلے درجے کا جھوٹا، دوغلا اور منافق جس کی کوئی زبان نہیں تھی۔

وقت جوں توں گزر رہا تھا۔ اس کے فضا سے شادی کے لیے اصرار بڑھ رہا تھا۔

فضا کے اندر کا اضطراب بڑھ رہا تھا...... سمجھ نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے کیا عمل سے تہی یہ شخص شادی کے لائق ہے، کیا اس کی بیوی بن کر وہ سکھی زندگی گزار سکے گی...... وہ خود سے سوال کرتی اور اس کا دماغ اس کے سوال کا تجزیہ کر کے جواب دیتا ”نہیں...... نہیں...... نہیں“ دل اس کے معاملے میں تو کبھی دماغ سے ٹکرایا ہی نہیں تھا کیونکہ دل میں وہ کبھی جگہ نہیں لے پایا...... دل نے اگر کبھی کسی کونے کھدرے میں اسے جگہ دی بھی تو اس کی حرکتوں کے باعث دل کو اسے نکالنا پڑا...... آخر مالک تو دل تھا نہ...... رکھے یا نہ، وہ کیا کر سکتی تھی۔

”مجھے تم سے شادی نہیں کرنی...... تم جو مرضی کرلو۔ میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔“ ہمیشہ کی طرح وہ اس کے اصرار پر اس کو ٹھکرا دیتی لیکن کب تک؟ وہ ضرورت کا پجاری تھا جن عورت زندگی کو بے کار سمجھتا تھا۔ شادی کے لیے تو وہ کب کا مان چکا تھا؟ بس فضا کے سامنے پرچار کرتا رہتا کہ دیکھو بس بات چلی ہے، کشیدگی رہتی ہے، کب رشتہ ٹوٹ جائے کب سب ختم ہو جائے...... اسے اپنے ساتھ نتھی رکھنے کے لیے چالاکیوں کا سہارا لیتا یا پھر ایک آس کہ شائد وہ مان جائے۔

فضا تو خود چاہتی تھی کہ وہ شادی کر لے بھلا مرد بھی تجرد کی زندگی گزار سکتا ہے۔ وہ جانتی تھی کہ جوگ کا روگ مرد کے کسی کی بات نہیں۔ پھر اس کی شادی کا دن آپہنچا۔

”جنوری میں اس کی شادی تھی، وہ اتنی دور گاؤں شادی میں شرکت نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے گفٹ لیا، سلامی کو لفافے میں ڈالا اور اس کے آفس پہنچ گئی...... اگر آج بھی اس نے محبت کا اظہار کیا اور اس کے پاؤں کو پکڑ کر رو دیا تو...... شاید آج وہ ہار جائے اس کی محبت کے سامنے پر اسے اچانک سامنے دیکھ کر وہ بوکھلا گیا“ وہ اپنے ایک دوست کو شادی ویسے کا سوٹ، اپنے کپڑے دکھا رہا تھا سب قیمتی تھے“ ایک سے بڑھ کر ایک......

اتنے میں فون آگیا۔

”او اچھا بھائی کو بھیجو، پچاس ہزار لے جائے۔ اپنی پسند کے کپڑے بنالو“ غالباً اس کی ہونے والی بیوی کا فون تھا۔

”یار فرصت ہی فرصت ہے تمہارے لیے بھابھی کے ساتھ آجاؤ رنگ محل یا اچھرہ چلتے ہیں، جیسے کہو گی، شاپنگ کرا دوں گا۔“ اس کی بیوی اس کے ساتھ شاپنگ کرنا چاہ رہی تھی۔

کتنے اعتماد سے بول رہا تھا وہ

اب اس کے پاس اس کی بیوی کے لیے فرصت بھی تھی اور پیسے بھی۔ ہونے والی بیوی پر پیسہ خرچ کیا جا رہا تھا...... اور جس کو اتنے سال بیوی بنا کر رکھا، جسے محبوبہ کا مقام دیا۔ بیوی کا تصوراتی روپ دیا، اس کے لیے وہ کنگال رہا۔

انار کلی، رنگ محل، اچھرہ...... سب انجان تھا وہ سارے گمان ٹوٹ گئے وہ بہت خوش تھا۔

آج فضا نے سب جان لیا تھا۔ آج بھی اس نے محبت کا دعویٰ کیا مگر آج یہی دعویٰ بالکل بے جان تھا...... کیونکہ اس میں سے ضرورت بھی نکل گئی تھی۔ وہ تہی دست نہیں اس کا دل اس کی محبت سے تہی تھا۔ فضا نے ایک نظر اس کے سوٹوں پر ڈالی دوسری اس کی جیب سے جھلکتے ہوئے وائلٹ پر...... وہ محبت کے دعوے میں تہی داماں نکلا تھا...... ہر ثبوت مل گیا تھا۔ اس نے اپنا پرس اٹھایا۔ کمرے میں تھوکا اور باہر نکل گئی۔ جیب سے جھلکتا وائلٹ اور وائلٹ سے جھلکتے نوٹ اس کی ڈبڈبائی آنکھوں کے سامنے ناچ رہے تھے۔

افسانہ

بابل تیرے آنگن کا چاند

طیبہ امبر/ نارنگ منڈی

"اللہ کسی کو یتیم بھی نہ کرے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ساری دنیا کے دکھ رل مل کے ایک ہی دامن میں بسیرا کرنے آجاتے ہیں۔" آج کی رات نیند کی دیوی پھر اس سے روٹھ کے کہیں اور جابسی تھی۔ آج رات پھر اپنی سوچوں سے لڑتے گزر رہی تھی اس کی۔ رات کا نجانے کون سا پہر تھا۔ اچانک اسے یاد آیا تو خود پہ ہنس پڑی۔

"زلیخاں تو وی جھلی ہے۔ بھلا ساری رات دکھوں سے لڑنے اور شکوے کرنے سے دکھ مک تھوڑی جاتے ہیں۔ اس دنیا کا تو دستور ہی ایسا ہے دکھ دیتی ہے دکھ دور نہیں کرتی۔ تو کب تک رات کو دکھڑے سناتی رہے گی؟" خود سے باتیں کرتے اس نے کروٹ بدلی تو کھڑکی کے کھلے پٹ سے چودھویں رات کا چاند نظر آیا تو ٹکٹکی باندھ کے بڑی حسرت سے آسمان پہ سجے اس چمکتے ٹکڑے کو دیکھنے لگی۔ جن شکوؤں پہ وہ کچھ لمحے پہلے خود پہ ہنسی تھی وہ شکوے ایک بار پھر جاگ اٹھے۔

تو خوبصورت سہی مگر داغدار بھی تو ہے۔ تیرے اس مٹیالے داغ کے باوجود دنیا تجھے سلام کرتی ہے بیٹیاں بھی تو اپنے بابل کے آنگن کا چاند ہوتی ہیں اور بابل کے آنگن کا چاند تو بے داغ ہوتا ہے، پھر بھی انگلی اٹھانے والے نجانے کتنے گرہن لگا دیتے ہیں۔ تجھے گرہن لگے تو تیری معافی ہو جاتی ہے اور مجھ پہ انگلی اٹھے تو پختہ دار کا حکم سنا دیتے ہیں۔ وہ اللہ تیری دنیا کے نرالے ریت رواج" اس کے خاموش شکوے چاند بھی مسکراتے ہوئے سننے لگا تھا۔

"نجانے یہ لوگ اتنے دوغلے کیوں ہیں۔" اس کے دل کی زبان ایک بار پھر سے گویا ہوئی۔ لب پہ تو وہ قفل لگا چکی تھی۔

"تیری داغدار صورت سے پھوٹتی روشنی پہ جان دیتے ہیں اور میری بے داغ محبت پہ میری جان کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ تیرے داغ پہ دلیل دے کر محبت کرنے کا ہنر سیکھتے ہیں اور آنگن کے چاند پر اللہ کی رحمت کا نور نظر نہیں آتا۔ تجھے محبت سے دیکھتے ہیں، غیرت سے سلام کرتے ہیں اور میرے لیے لفظوں میں آگ لہجوں میں سختی ہوتی ہے۔ نظروں میں رحم اور عزت کی بجائے نفرت اور توہین ہوتی ہے۔ اے آسمان کے چاند تو داغ والا ہو کے بھی معتبر ہے، اور آنگن کا چاند رحمت بن کر بھی کمتر ہے۔ کیوں تجھے دلوں سے جوڑتے ہیں اور میرا دل توڑ دیتے ہیں۔ کسے بتاؤں ایسے دوغلے قانون کا منصف؟ یہ دوغلے لوگ اللہ کے عذاب سے ڈرتے کیوں نہیں ہیں آخر؟ یہ دل جوڑ نہیں سکتے تو دل توڑتے بھی کیوں ہیں؟" اس کے شکوے سنتے سنتے چاند کھڑکی سے اوجھل ہونے لگا۔ بس اتنا سا نظر آرہا تھا جیسے چوری چوری ایک آنکھ نکال کے دیکھ رہا ہو کہ اس نے آنکھیں بند کیں یا نہیں۔ شائروں بھی اس کے شکوؤں سے آزردہ ہونے لگا تھا تبھی وہ اپنی روشنی کہیں اور بکھیرنے کے لئے آگے نکل گیا اور زلیخاں اپنی اندھیر زندگی کی طرح اندھیرے کمرے میں اکیلی اپنی سوچوں سے لڑنے لگی تھی۔ نجانے کب تک لڑتی رہتی کہ اس کے کانوں میں آپاں زہرہ کے بانگے ککڑ کی آواز پڑ گئی۔ رات کے اندھیرے اور گہری سوچوں کی طرح یہ بانگا ککڑ بھی اس کا ساتھی بن چکا تھا۔ شاید اس کو بھی پتہ چل گیا تھا کہ نمانی کی سوچوں کے رستے کسی منزل کی طرف نہیں جاتے کہیں وہ کسی پرائے اور اوکھے رستے پر بھٹک نہ جائے اس لیے اپنی بانگ سے وہ اسے "پرائے" کے رستے پر جانے سے روک کر "اپنے" کے رستے کی طرف بلا لیتا تھا اور اب بھی اس نے ایسا ہی کیا تھا۔ زلیخاں اٹھی اور صحن میں لگے نلکے کی طرف چل پڑی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا یہ "اپنا" اس کے سوہنے اللہ کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ اس نے وضو کیا اور کمرے میں واپس آ کر جائے نماز بچھا کے کھڑی ہو گئی۔

....

"صدقے جاؤں میں سوہنیا اللہ تجھ پہ جو اک پل میں مجھے میرے سارے دکھوں سے بیگانہ کر کے اپنی محبت اور رحمت کی چادر میں چھپا لیتا ہے۔" زلیخاں نے نماز پڑھ کے جیسے ہی دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو لفظوں سے پہلے آنسوؤں نے نکلنے میں پہل کر دی۔ پھر بھی ہولے ہولے اس کے لب ہلنے لگا اور دل بولنے لگا۔

""ساری رات دکھوں اور دکھ دینے والوں سے لڑتے گزر جاتی ہے مگر جیسے ہی تیرے در پہ سر جھکا کے ہاتھ اٹھاتی ہوں نہ دکھ یاد رہتے ہیں نہ دکھ دینے والے یاد رہتا ہے تو بس میرے سوہنے اللہ اک تو یاد رہتا ہے اک تیری ہی ذات کا مکان ہے مجھے اک تو ہی تو ہے جو سارے دکھ سن کے ان کو سمیٹ لیتا ہے، میرے سوہنے اللہ میری فریاد سن، تیرے سوا میرا کوئی نہیں مجھ دکھیاری کے بھی دکھ مکا دے، اپنی رحمت کی نظر کر مجھ پہ میرے رکھوالے ہی میرے دشمن بن گئے

ہیں۔ تو میری عزت رکھ لے میرے مولا اور عزت سے مجھے پار لگا دے میرے سوہنے اللہ'' وہ روتی رہی اور اپنے اللہ سے فریاد کرتی رہی جب دل ہلکا ہو گیا تو منہ پر ہاتھ پھیر کے اٹھی اور جائے نماز سمیٹ کر ایک طرف رکھی اور پھر سے اپنی چارپائی پر آ کے لیٹ گئی۔ اس کے آنسو ابھی تھمے نہیں تھے مگر روانی میں کمی آ گئی تھی۔ ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کرتے ہوئے اسے اپنی سہیلی نوری کی باتیں یاد آ گئیں۔ ایک دن نوری نے زلیخاں کو نماز کے بعد دعا مانگتے ہوئے دیکھ لیا تو حیران رہ گئی۔ اتنے جذب اتنی بے خودی سے تو نوری نے کبھی دعا نہیں مانگی تھی۔ وہ زلیخاں سے پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

''لے دس بھلا ایسا کیا مانگتی ہے دعا میں جو اتنا روتی ہے؟'' زلیخاں جیسے ہی جائے نماز سمیٹ کے اٹھی نوری کے پوچھنے پہ ٹھٹھک کر رکی۔ کیونکہ اسے تو پتہ ہی نہیں چلا تھا کہ اس کے کمرے میں نوری کب آئی۔ ''اللہ سے عشق مانگتی ہوں۔'' اس نے مسکرا کر نوری کو جواب دیا اور اس کے برابر ہی چارپائی پر بیٹھ گئی۔

''ہا، ہا، ہا، اس کا مطلب ہے تو اللہ سے یوسف مانگتی ہے'' نور زور سے ہنسی اور اس کی بات کا مذاق اڑایا۔ اس کی نظر میں عشق بس مرد ذات تک ہی تھا۔

''ناں جھلیے میں تو یوسف کا عشق مانگتی ہوں۔'' اس نے نوری کے مذاق کا برا مانے بغیر ایک بار پھر مسکرا کے اسے جواب دیا۔

''ناں زلیخاں کا عشق تو یوسف تھا، یہ بات تو پلے پڑتی ہے۔ مگر یوسف کا عشق کون تھا بھلا؟'' اس کی بات پہ نوری نے بہت حیرانی سے پوچھا تھا۔

یوسف کا عشق اللہ تھا جھلیے۔ اور میں اپنی دعاؤں میں اللہ سے اللہ مانگتی ہوں۔ دنیا کے سارے عشق دکھوں میں بدل جاتے ہیں پر اک واحد میرے اللہ کا عشق ہے جو سارے دکھ سمیٹ لیتا ہے۔ جسے رو کر اللہ کا عشق مل جائے اسے اور بھلا کیا چاہیے؟'' زلیخاں نے بڑے جذب کے عالم میں نوری کو جواب دیا۔

''قسمے رب دی زلیخاں جب تو ایسی باتیں کرتی ہے ناں تو بالکل اللہ لوک لگتی ہے۔ نہ کیا کر ایسی درویشوں والی باتیں اور ناں ہی اتارو یا کر'' باہر سے نلکا چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ ایک دم چونکی اور پھر نوری اور اس کی باتوں کو ذہن سے جھٹکا اور اٹھ کے قرآن پاک لینے پر چھتی کی طرف بڑھ گئی'' اللہ لوگ تو دکھوں سے بیگانے ہو جاتے ہیں۔ میرے سوہنے اللہ تو مجھے بھی سارے دکھوں سے بیگانہ کر دے۔'' قرآن پاک کھولنے سے پہلے اس نے نوری کی آخری بات پہ ایک بار پھر اپنے اللہ سے سرگوشی میں فریاد کی اور قرآن پاک سے غلاف اتارنے لگی۔

....

''آپاں زہرہ کے گھر سے پیغام آیا تھا، بلا رہی ہیں وہ تجھے۔'' وہ اپنی چارپائی کے بستر کی چادر ٹھیک کر رہی تھی جب کمرے کے دروازے میں کھڑی بھرجائی نے بڑے اکھڑے لہجے میں اس تک آپاں زہرہ کا پیغام پہنچایا۔ اور اس کا جواب سنے بنا چلی گئی۔ آج جمعرات تھی اور آپاں زہرہ ہر جمعرات کو کھیر پکا کر بچوں میں تقسیم کیا کرتی تھیں۔ پنڈ کے بچے ان کے پاس سیپارہ پڑھنے آتے تھے۔ آپاں زہرہ ہر جمعرات کو ان سب بچوں سے پہلے درود پاک کی محفل کرواتیں اور پھر کھیر بانٹتیں اور ہر جمعرات کو وہ زلیخاں کو ضرور بلاتی تھیں۔ اور ہر جمعرات زلیخاں کے آپاں زہرہ کی طرف جانے پہ بھرجائی ویر کو نجانے کیا کہتی کہ واپسی پر اسے ویر کا غصہ سہنا پڑتا تھا۔ شاید وہ یہ چاہتی تھی کہ زلیخاں گھر میں پڑی رہے نہ وہ کہیں جائے نہ کسی سے ملے۔ اسے یہ شک تھا کہ زلیخاں لوگوں کو جا کر یہ بتاتی ہے کہ اس کی بھرجائی اور ویر اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے اور نہ ہی اس کا خیال رکھتے ہیں۔ مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ زلیخاں نے کبھی اپنے ویر کا بھرم نہیں توڑا۔ کبھی اس کی عزت پہ کوئی حرف نہیں آنے دیا۔ مگر اس نادان عورت کو کون سمجھائے، وہ تو آپاں زہرہ کا پنڈ میں ایک مقام ہے عزت کرتے ہیں سارے پنڈ والے ان کی اس لیے ان کا کہا کوئی ٹالتا نہیں ہے۔ اس لیے بھرجائی اور ویر اسے آپاں کی طرف جانے سے روکتے نہیں تھے مگر واپسی پر اسے اپنے شک اور نفرت کے کٹہرے میں کھڑا کرنا ان کا فرض اور معمول بن چکا تھا۔ اس نے بڑی سی چادر اوڑھی اور خود کو اچھی طرح سے ڈھانپ کر کمرے سے نکل آئی۔ صحن میں لگے نلکے کے نیچے برتنوں کا ڈھیر رکھے بھرجائی ان کو دھونے میں مصروف تھی۔ جیسے ہی زلیخاں پہ نظر پڑی بھرجائی کے ماتھے پہ کئی بل پڑ گئے اور وہ بڑبڑانے لگی۔

''بھرجائی آج جمعرات ہے، آپاں جی کھیر پکانے کے لئے بلایا ہوگا، میں...... جلدی آ جاؤں گی۔'' بھرجائی کے قریب سے گزرتے ہوئے وہ ذرا دیر کے رکی اور بھرجائی کے تیوروں سے سہم کر ہلکی آواز میں اسے کہا جو کہ ایک طرح سے اجازت لینے کا طریقہ تھا۔ وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ ''میری بلا سے بی بی واپس آ ؤ یا ناں آؤ۔'' بھرجائی نے گلاس ٹوکری میں رکھے برتنوں پر پٹخا اور حسب عادت شروع ہو گئی۔

''پتہ نہیں کب تک اس گھر کی نمک حرامی ہوتی رہے گی۔ کھایا اس گھر کا جاتا ہے اور کام لوگوں کے کیے جاتے ہیں۔ ناں اس گھر کی عزت کا کوئی خیال اور ناں گھر والے کا کوئی احساس۔ ہونہہ ایسے رشتوں سے تو بندہ کلا ای چنگا۔'' زلیخاں نے داخلی دروازہ پار کرنے تک بھرجائی کی ساری کڑوی کسیلی بہری بن کے سنیں اور باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا اور آگے چل پڑی۔ اس بات سے بے خبر کہ آج بابل کے آنگن سے ہمیشہ کے لیے نکل آئی ہے اور دروازہ بھی اپنے ہی ہاتھوں بند کر دیا ہے۔

....

''اسلام وعلیکم آپاں جی!'' زلیخاں آپاں زہرہ کے گھر میں داخل ہوئی تو سامنے ہی چارپائی پر بیٹھی آپاں زہرہ چاول چنتی نظر آ گئیں۔ زلیخاں نے مسکرا کر سلام کیا۔

''وعلیکم اسلام! جیتی رہو، اللہ نصیب اچھے کرے۔'' آپاں جی نے چاولوں کی پرات سے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور خوش ہو کر اس کے سلام کا جواب دیا اور ساتھ ہی دعا بھی دی۔

''بہت اچھا کیا جو آ گئی ہو۔ آج تو دیر ہی ہو گئی۔ بچے بھی بس آنے ہی والے ہیں۔ آؤ بیٹھو ادھر میرے پاس۔'' آپاں زہرہ نے چاولوں کی پرات پرے کھسکاتے ہوئے اس کے لئے اپنے پاس بیٹھنے کی جگہ بنائی۔ اور وہ ان کے پاس بیٹھ گئی۔ ''تیری بھرجائی نے کچھ کہا تو نہیں تجھے ادھر آنے پہ؟'' آپاں زہرہ نے چاول چنتے ہوئے بڑے عام سے لہجے میں زلیخاں سے پوچھا۔

''نہیں آپاں جی کچھ وی نہیں کہا بھرجائی نے۔ اور آپ کی طرف آنے سے نہیں روکتی وہ مجھے۔'' زلیخاں نے بھی انہی کی طرح عام سے ہی لہجے میں جواب دیا۔

''ہوں.........'' آپاں زہرہ نے لمبی سی ''ہوں'' کہی مگر کریدا نہیں۔ کیونکہ وہ جانتی تھیں بھرجائی کا رویہ بھی اور لہجہ بھی۔ ایک بار بھرجائی کے پیسے گم ہو گئے تو بھرجائی کے واویلا مچا مچا کے لوگ اکٹھے کر لیے اور بھرے مجمے میں زلیخاں کا نام لگا دیا۔ محلے کی کچھ چغل خور اور بھرجائی جیسی کم عقل عورتوں نے بھرجائی کا ساتھ دیا لیکن زیادہ تر نے بھرجائی کی ایسی اوچھی حرکت پہ نفرین بھیجی اور زلیخاں کی بے بسی پہ افسوس کرتیں اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئیں۔ جن میں سے ایک آپاں زہرہ بھی تھیں۔ اور تب سے ہی وہ بھرجائی کا زلیخاں کے ساتھ سلوک پہچان چکی تھیں۔ پھر آہستہ آہستہ وہ زلیخاں کا سہارا بن گئیں۔ کھیر پکوانے کا تو ایک بہانہ تھا ورنہ وہ تو زلیخاں کو کچھ دیر کے لئے بھرجائی کی جلی کٹی سننے سے بچانے کے لئے بلا لیتی تھیں۔ پھر زلیخاں بھی ان کے قریب ہوتی گئیں۔ اور پنڈ میں واحد ایک آپاں زہرہ تھیں جن سے وہ نہ چھپ سکتی تھی اور نہ اپنے حالات چھپا سکتی تھی۔ اور دکھ بھی اسی بات کا تھا کہ جو سہارا بھائی کو بننا چاہیے تھا وہ آپاں زہرہ بن گئیں تھیں۔ ''زلیخاں! پتر کن سوچوں میں ہے؟'' آپاں زہرہ کے پکارنے پہ زلیخاں چونک پڑی۔ جب وہ آوازیں دینے پہ زلیخاں متوجہ نہیں ہوئی تو آپاں زہرہ نے اس کو کندھا ہلا کے پکارا۔

''نہیں! کچھ وی نہیں آپاں جی۔ بس ایوں ای۔'' زلیخاں نے چونکتے ہوئے آپاں آپاں جی کو جواب دیا اور سوچوں کو جھٹکا۔

''اچھا چل اک واری اب یہ چاول تو دیکھ لے اک نظر کوئی کنکر رہ نہ گیا ہو۔'' چاولوں کی پرات اس کی طرف کھسکاتے ہوئے وہ خود کسی کام سے اٹھ گئیں اور زلیخاں نے چاولوں کی پرات چارپائی سے اٹھا کے اپنی گود میں رکھ لی۔

....

''اسلام وعلیکم آپاں جی! یہ لیں جی دودھ لائی ہوں کھیر میں حصہ ڈالنے کے لئے غلام رسول ابھی ابھی لایا تھا حویلی سے اور میں بالٹی ادھر اٹھا کے لے آئی ہوں۔'' ماسی ہاجراں کے پوتے آپاں زہرہ کے پاس سپارہ پڑھنے آتے تھے۔ اس لیے وہ ہر جمعرات کھیر میں حصہ ضرور ڈالتی۔

''اللہ منظور کرے اور برکت ڈالے، بھلا ہو تیرا۔'' آپاں جی نے خوش دلی سے دعا دی۔ ''کیہ حال اے تیرا زلیخاں پتر؟'' ماسی نے زلیخاں کی سامنے والی چارپائی پہ بیٹھتے ہوئے اس کا حال پوچھا۔

''شکر ہے اللہ کا ماسی، تو سنا؟''

''بس دھیے جیہڑا ویلا لنگ جائے اوہی چنگا۔ شکر اے رب دی ذات دا۔''

ماسی ہاجراں نے بڑی عاجزی سے جواب دیا۔

''زلیخاں پتر ایس گرمی میں تو نے یہ ریشمی کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ ناں تجھے گرمی نئیں لگدی؟'' ماسی ہاجراں اس کے ریشمی کپڑے دیکھ کر پوچھنے لگیں۔

''ناں ماسی مجھے ایسے نخرے نئیں۔ آتے۔ اور پھر پنڈ کی کھلی ہوا میں بھلا گرمی کیسی۔'' اس نے ماسی کو بڑے بے نیاز لہجے میں جواب دیا۔ اور بے نیازی کے پیچھے سوچ وہی کے اپنے بھائی اور بھرجائی کا بھرم رکھنا ہے۔

''ناں پتر گرمی سردی کا واسطہ پنڈ شہر سے نئیں ہوتا انسان کے جسم سے ہوتا ہے۔ یہ پنڈ شہر کی تو بس

"گل بنائی ہے لوگوں نے۔" ماسی نے اس کی بے نیازی جیسے اس کے منہ پہ دے ماری تھی اور وہ لاجواب ہوگئی۔ "تو میری گل سن میری دھی۔ میرے پاس کاٹن کا ایک سوٹ پڑا ہے، تیرا چاچا لایا تھا شہر سے، میں ایسا کرتی ہوں وہ تجھے بھیج دیتی ہوں، توں میری دھی وہ سلائی کر کے پہن لینا، توں وی تو میری دھیوں جیسی ہے ناں۔" ماسی نے بڑے اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔

"میں کوئی منگتی نہیں ہوں ماسی جو دوسروں کے دیئے کپڑے پہنتی پھروں۔ اللہ میرے ویر کو سلامت رکھے۔ اس کے ہوتے مجھے کیا ضرورت ہے کسی غیر کے دیئے کی۔" زلیخاں تو ماسی ہاجراں کی بات پہ تڑپ ہی اٹھی تھی۔ اسے لگا جیسے ماسی نے بھرے بازار میں اسے کوڑا مار دیا ہے۔ وہ یتیم تھی لیکن عزت نفس تو وہ بھی رکھتی تھی۔ اور پھر پرانی عادت کہ بھائی کا بھرم اسے توڑنا آتا ہی کب تھا۔

"لے دس میں نے کون سی کوئی بری گل کہہ دی ہے، تیرا احساس ہی کیا ہے ناں۔ کیوں آپاں جی؟" ماسی ہاجراں نے حیران ہوتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی اپنی بات کی تائید آپاں زہرہ سے بھی چاہی۔

"مجھے ایسا احساس نہیں چاہیے ماسی جس میں میرے ویر کی بے عزتی ہو۔"

آپاں زہرہ کے بولنے سے پہلے زلیخاں بول پڑی تھی۔

"ناں دھیے اس میں کون سی بے عزتی ہے تیرے ویر کی؟ اور میری گل سن پتر؟ کن خیالوں میں رہتی ہے تو، جتنا تیرا خیال تیرا ویر رکھتا ہے ناں وہ سارے پنڈ کو پتہ ہے۔ یہ چوتھے لارے نہ خود کو دے نہ پنڈ کو سناتے میری اک گل یاد رکھیں دھیے۔ ماں باپ کے بعد جب دھی کلی رہ جائے اور کنواری رہ جائے تو سب سے زیادہ بھرا بھرجائی جینا اوکھا کر دیتے ہیں اس کا۔ اور توں ناں وی آکھ کچھ، پر سیانے تجھے دیکھ کے ہی سمجھ لیتے ہیں تیرا حال۔ میری گل کا برا ناں منا، میں نے ہی کہا ہے جو سارا پنڈ کہتا ہے۔" زلیخاں کی بات پہ ماسی نے اس کے بھرا بھرجائی کے خلاف دبا ہوا سارا ابال نکال دیا اور آخری بات زلیخاں کے سر پہ ہاتھ رکھ کے بڑے پیار سے کہی تھی۔ وہ بھی جانتی تھی کہ زلیخاں بڑے صبر والی ہے اور اپنے بھائی کی محبت میں کسی کو اپنا دکھ ظاہر نہیں کرتی۔

"چنگا آپاں جی شام کو آؤں گی رب راکھا۔"

ماسی ہاجراں دوبارہ آنے کا کہہ کر اور زلیخاں و گہری سوچ میں ڈ ا چھوڑ کر چلی گئی۔ ماسی ہاجراں نے اس کے کھوکھلے بر ، جواب اتنی سفاکی سے دیا کہ زلیخاں سے جواب میں کچھ بولا ہی نہ گیا اور وہ اپنی سوچوں میں گم بیٹھی رہ گئی۔

"میں جانتی ہوں تو اس بیوقوف بھائی کا بھرم رکھتی ہے، لیکن یہ جو پنڈ والے ہیں ناں پتر یہ ہم سے زیادہ ہمارے گھروں کی خبر گیری رکھتے ہیں یہ کوئی شہر نہیں ہے جہاں ساتھ والے گھر میں مرگ ہو جائے تو ہمسائے کو پتہ ہی نہیں ہوتا۔ پنڈ کے لوگ اک دوجے سے جڑے ہوتے ہیں۔ ناں میری دھی اتنا اوکھا بولا کر کسی کے ساتھ۔ جھلیے لوگ سچ بولتے ہیں اور تو صرف بھرم کی زبان بولتی ہے اور یہ سچ اور بھرم کبھی برابر نہیں ہوتے۔" آپاں زہرہ نے گم سم بیٹھی زلیخاں کو حقیقت سے روشناس کروایا۔

"آپاں جی وہ جیسا بھی ہے میرا ویر ہے۔ اور ویروں کا بھرم تو بہنیں ہی رکھتی ہیں ناں۔ کسی بہن سے یہ برداشت نہیں ہوتا کہ کوئی اس کے ویر کے خلاف بولے۔ بھلا میں کیسے برداشت کروں؟" وہ اب بھی اپنی ہی بات پہ قائم تھی۔ "ہاں، ہاں مجھے سب پتہ ہے، تو بالکل ٹھیک کہتی ہے لیکن پتر غلط یہ لوگ بھی نہیں کہتے، اب دیکھ ناں دو وقت کی روٹی تو جیل میں قیدیوں کو بھی مل جاتی ہے، بوہے پہ آئے فقیر کو بھی دے دیتے ہیں پھر تجھے دو وقت کی روٹی دے کے باقی ہر چیز اور ہر ذمہ داری سے آنکھیں بند کر لینا کہاں کا انصاف ہے؟ نہ تیرا حق ادا کریں نہ تیرا فرض ادا کریں یہ ظلم نہیں تو اور کیا ہے؟ اور اوپر سے بیوی کے کہنے میں آ کے جب مرضی تیری بے عزتی کر دیتا ہے گھر کی چار دیواری میں بیٹھے ہوئے بھی تجھ پہ الزام لگا دیتا ہے یہ کوئی مردانگی ہے بھلا؟ چل ناں دے تجھے کچھ وی مگر عزت اور پیار تو دے دے تجھے۔ تو اس کی چھوٹی بہن ہے اس کی بیٹیوں جیسی ہے کچھ تو تیرا خیال کرے۔ اور ایک تو ہے جو ہر جگہ ہر کسی کے آگے اس کا بھرم رکھتی نہیں تھکتی۔ میری دھی تو غصہ نہ کیا کر، لوگ وہی کہتے ہیں جو دیکھتے ہیں۔ تیرا بھائی بیوقوف ہے اسے سمجھ نہیں ہے ابھی کہ وہ کیا کر رہا ہے اور جب تک اسے سمجھ آئے گی وقت اس کے ہاتھ سے نکل چکا ہوگا۔ تو بس دعا کیا کر کہ اللہ اسے ہدایت دے اور جتنا تو اس کا بھرم رکھتی ہے وہ بھی تیرا مان رکھنا سیکھ لے چل اٹھ اب، آ جا کھیر پکائیں کب کی آگ جل گئی ہوئی ہے۔ چل آ جا چھڈ دے ان سوچوں کو، آ میری دھی۔" آپاں زہرہ نے بڑی تسلی سے سمجھایا اسے اور پھر اس کے سر کو تھپتھپاتے ہوئے اٹھ کر چولہے کی طرف چلی گئیں۔ اس نے بھی اپنے بہتے آنسو صاف کیے اور خاموشی سے اٹھ کے کھیر میں ڈالنے کے لئے چاول بھگونے نلکے کی طرف چل دی۔

....

کس کس کو ٹیم (ٹائم) دیا ہوتا ہے تو نے جو ساری دیہاڑی گھر سے باہر کڈ کے آتی ہے؟ یہ ویلا ہے تیرے گھر آنے کا۔ ناں میں پوچھتا ہوں تیری یہ آوارگی مکنی (ختم) ہے کہ نہیں یا توڑوں تیری ٹانگیں اور ڈالوں تجھے کھاٹ پہ۔؟'' آج آپاں زہرہ کے گھر سے آنے میں دیر ہو گئی تھی۔ مغرب کی اذان ہوئے بھی ڈیڑھ گھنٹہ ہو چکا تھا۔ آپاں زہرہ نے اسے تسلی دے کر بھیجا تھا کہ وہ بھی کھیر دینے کے بہانے اس کے پیچھے آتی ہیں تا کہ اگر اس کی بھرجائی یا بھائی اسے کچھ کہیں تو آپاں زہرہ خود ان کو سمجھا دیں گی۔ اور وہی ہوا جس بات کا اسے ڈر تھا۔ وہ جیسے ہی گھر میں داخل ہوئی رحیم غصے میں بپھرا ہوا چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا اور لگا بولنے۔ جبکہ چارپائی پہ بیٹھی بھرجائی نے زلیخاں کی طرف دیکھ کر ہاتھ کو یوں جھٹکا جیسے اسے ''دفع دور'' کیا ہو اور ساتھ ہی منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

''ویر میں بھرجائی کو بتا کر گئی تھی کہ آپاں زہرہ کے گھر جا رہی ہوں بلکہ پہلے تو بھرجائی نے ہی مجھے آپاں زہرہ کا پیغام دیا تھا بے شک بھرجائی سے پوچھ لو۔'' اس نے جلدی سے وضاحت دی اور ڈرتے ہوئے ایک نظر بھرجائی کو دیکھا کہ شاید وہ اس کی تائید میں کچھ بولے لیکن وہ منہ موڑے بیٹھی رہی۔ ''او چل'' (ان دو لفظوں میں بولی گئی نفرت اور حقارت نے زلیخاں کو دہکتی آگ میں پھینک دیا)

''میں سب جانتا ہوں توں جہاں جاتی ہے اور جہاں سے آتی ہے۔ یہ آپاں زہرہ کے گھر کے بہانے کسے ہور کو سنانا۔'' یہ کہتے رحیم نے چارپائی کے پاس پڑا ہوا رنگین ڈنڈا اٹھا لیا۔ یہ رنگین ڈنڈا وہ ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ کھیتوں میں جاتا تب بھی اور گھر میں ہوتا تب بھی۔

''نہیں ویر میرا یقین کرو میں جھوٹ نہیں بول رہی۔ تم آپاں زہرہ سے پوچھ لو وہ آتی ہوں گی۔'' اس نے خوف زدہ ہو کر دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے کہا اور دل میں دعا کی کہ آپاں زہرہ جلدی آ جائیں۔

''بھرجائی تو بولتی کیوں نہیں؟ بتاناں ویر کو میں تجھے بتا کر تو گئی تھی۔'' رحیم کے تیور مزید بگڑتے دیکھ کر زلیخاں نے بھرجائی سے مدد مانگی۔

''ناں ناں میں کچھ نہیں جانتی یہ کہاں تھی اور کہاں سے آئی ہے۔ میری تو اس گھر میں ایک نوکرانی سے زیادہ کی حیثیت ہی نہیں ہے ناں مجھ سے پوچھتی ہے ناں بتاتی ہے اور نکل جاتی ہے منہ اٹھا کے جہاں مرضی۔ اب مجھے بھلا کیا پتہ کہ کہاں گئی اور کہاں سے آئی۔'' بھرجائی نے ہاتھ نچا نچا کر رحیم کی نفرت کے الاؤ پر اپنے لفظوں کا تیل چھڑک دیا اور وہ نفرت کا الاؤ مزید بھڑک اٹھا۔

''ہاں اب بتاؤ اب کس کو بلائے گی صفائیاں دینے؟'' رحیم نے بھڑکتے ہوئے اپنے رنگین ڈنڈے پر ہاتھ کی گرفت مضبوط کی اور اس کی طرف بڑھا۔

''نہیں ویر نہیں، ایسا کچھ وی نہیں...... بھرجائی غلط کہہ رہی ہے میرا یقین کرو میں تو..........'' رنگین ڈنڈے کی پہلی ضرب نے اس کے منہ سے نکلتے باقی لفظ درد بھری آہ میں بدل دیئے۔ پھر نجانے کب تک اور کتنے بے رحم وار اس کے ناتواں جسم پر کیے گئے۔ وہ چیختی رہی، آہ و بکا کرتی رہی۔ نفرت کے بھڑکتے الاؤ نے اس کے جسم کو جھلسایا اور حقارت کے بے درد لفظوں نے اس کی روح کو لہولہان کر دیا۔ وہ تڑپ تڑپ کر باپ کو پکارنے لگی۔ ''کیا اس دن کے لئے اپنے آنگن میں چاند مانگا تھا بابلا تو نے؟'' دیکھ بابلا کیسے کیسے گرہن لگائے جا رہے ہیں تیرے چاند کو، آج کون سنے میری آج میں کس کو جا کے بتاؤں بابلا؟''

وہ تڑپتی رہی سسکتی رہی یہاں تک کہ آخر ہوش وخرد سے بیگانی ہونے لگی کہ اچانک اس کے کانوں میں ایک مہربان آواز پڑی تو جیسے جاں کنی کا وقت تھم گیا۔ اس نے اندھیروں میں ڈوبنے سے پہلے ذرا سی آنکھیں نیم وا کرنے کی کوشش کی کہ آنے والی مہربان ہستی کو دیکھ سکے مگر ناکام ہو گئی۔

....

''ہائے وے ظالما تیرا ککھ نہ رہے'' آپا زہرہ جیسے ہی گھر کے اندر داخل ہوئیں تو زمین پہ گری زلیخاں پر نظر پڑتے ہی ان کا کلیجہ منہ کو آ گیا۔ ہاتھ میں پکڑی کھیر کی پلیٹ وہیں زمین بوس ہو چکی تھی۔ آپا زہرہ جلدی سے گری ہوئی زلیخاں کی طرف لپکی اور ایک قہر بھری نظر رحیم پر ڈالی اور اسے کوسنے لگیں۔ رحیم بھی ان کو دیکھ کر دو قدم پیچھے ہٹا۔ آپا زہرہ زمین پر زلیخاں کے قریب بیٹھ کر اس کا سر گود میں لیتے ہوئے تڑپ اٹھیں۔ ''وے تجھے رحم نہیں آیا اس معصوم پہ ظلم کرتے۔؟''

''آپاں جی آپ ہمارے گھریلو مالے (معاملے) میں دخل نہ دیں۔ یہ ہمارا آپس کا مسئلہ ہے آپ ناں آئیں اس میں۔'' رحیم نے آواز کچھ دبا کے مگر رکھائی سے آپاں زہرہ کو کہا۔

''وے ظالما یہ گھریلو معاملہ نہیں قتل کا معاملہ ہے۔ اس بے گناہ نمانی کو قتل کر رہا ہے تو، خون کر رہا ہے اس یتیم کا، وے یتیم کا تو دل دکھانے والے پہ اللہ لعنتیں بھیجتا ہے اور تو اس پر اتنا ظلم کر کے کہتا ہے یہ گھریلو معاملہ ہے؟ بدبختا اللہ کے عذاب کو آواز دے رہا ہے تو۔'' زلیخاں کو گود میں لیے آپاں زہرہ مسلسل رحیم کو کوس رہی تھیں۔ اوبس کریں آپاں جی، اب اور

کچھ نہ بولنا۔ بڑی عزت کرتا ہوں میں آپ کی........ "ابھی رحیم کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ آپاں زہرہ بول اٹھیں۔

"وے چل جا بڑا آیا عزت کرنے والا، اس ماں جائی کو تو عزت دے نہیں سکا، کسی باہر کی عورت کی کیا عزت کرے گا۔ سارے پنڈ میں تیری عزت بناتی تھک گئی یہ نمانی، اور تو نے یہ صلہ دیا ہے اس کو کہتا ہے اخے عزت کرتا ہوں۔ ہونہہ! عزت اور تیرے جیسا جانور کرے بدبخت ناں ہو تو۔" آپاں زہرہ نے رحیم کی ایک بات پر اچھی خاصی سنا ڈالیں تھیں رحیم کو۔ اس سے آگے وہ کچھ بولنے کے قابل نہ رہا تھا۔ "اور تو وہاں کھڑی تماشا دیکھ رہی ہے۔" آپاں زہرہ کا رخ اب رحیم کی بیوی کی طرف تھا۔ "تجھے ذرا حیا نہیں آئی اس پہ اتنا ظلم کرواتے اور دیکھتے؟ تیری اپنی بھی بیٹیاں ہیں۔ اللہ کے عذاب سے ڈر آج اس یتیم کے ساتھ یہ ظلم کروا رہی ہے کل کلاں کو تیرے آگے وہی آئے گا یہ سب........"

"ایسی بد دعائیں ناں دیں آپاں جی یہ ان بہن بھائی کا مسئلہ ہے میں نے کیا کیا ہے بھلا؟" اپنی بیٹیوں پہ بات آئی تو بھرجائی تڑپ کے بول اٹھی۔

"ہاں ہاں جب ظلم کرنا ہو تب بھائی بن جاتا ہے اور جب فرض ادا کرنے کی بات آئے تب بہن یاد نہیں رہتی؟ جب اس کے حق مارتا ہے تب اسے نہیں پتہ ہوتا کہ یہ نمانی اس کی بہن ہے؟ تم ظالموں پر اللہ کا عذاب آئے۔ اور اک گل میری کان کھول کے سن وے بدبختا۔" آپاں زہرہ نے رحیم کو مخاطب کیا۔ "لے کر جا رہی ہوں میں اس کو اپنے گھر اگر تجھے ذرا سی بھی شرمندگی ہوئی اپنے کیے پر اور عقل آ گئی تو اس کو لینے آ جانا ورنہ اس کی طرف منہ ناں کرنا، نہیں تو پنڈ والوں سے کہہ کے تیری ٹانگیں تڑوا دوں گی۔" یہ کہہ کر وہ زلیخاں کو ہوش کروانے لگیں۔ "آ ہو آ ہو لے جائیں۔ میں اب اس کو گھر میں رکھنا بھی نہیں چاہتا۔ میری وی بیٹیاں ہیں۔ کہیں اس کی دیکھا دیکھی وہ بھی نہ آوارہ ہو جائیں۔" رحیم نے نفرت اور حقارت کا ایک اور وار کیا۔ اور یہ کہتے ہوئے وہ بھول گیا کہ کچھ دیر پہلے اس نے آپاں زہرہ کو یہ کہہ کر غیر ہونے کا طعنہ دیا تھا کہ یہ ہمارا گھریلو معاملہ ہے۔ اور اب وہ اپنا گھریلو معاملہ آپاں زہرہ کو لے جانے کو کہہ رہا تھا۔

"وے جا، یہ تو اب تجھے وقت ہی بتائے گا کہ معاملہ گھریلو ہے یا اللہ کا۔"

آپاں زہرہ نے تنگ کر رحیم کو جواب دیا۔ اور زلیخاں کو ایک بار پھر ہوش کروانے لگیں۔

"اٹھ میری بچی اٹھی شاباشے ہوش کر، مک گیا اج تیرا دانہ پانی بابل کے ویہڑے سے، اٹھ میری دھی ہمت کر۔" آپاں زہرہ بڑی ہمت سے زلیخاں کو گھسیٹ کے دروازے تک لائیں۔ نیم بے ہوشی کے عالم میں آپاں زہرہ کے کندھے پر بازو پھیلائے گھسٹتے ہوئے زلیخاں نے دروازے سے نکلتے ہوئے ایک آخری نگاہ اس آنگن پر ڈالی جس کا وہ چاند تھی اور آج وہ چاند گہنا کے ڈوب رہا تھا اور نفرت سے دیکھنے والے نے اس چاند پہ تھوک دیا تھا یہ سوچے بنا کہ یہ تھوک واپس اپنے ہی چہرے پہ گرتا ہے۔

....

"ماں باپ کے مرنے کے بعد ہر رشتہ عارضی ہو جاتا ہے، سب پرائے اور غیر بن جاتے ہیں سوائے اک رشتے کے، اور وہ رشتہ بندے کا اپنے اللہ سے ہوتا ہے، سب رشتے دکھ دینے والے بن جاتے ہیں اور اللہ سے رشتہ سارے دکھ سمیٹ لیتا ہے۔" آپاں زہرہ ایک پیالی میں دلیہ لیے زلیخاں کے پاس آ کر بیٹھ گئیں اور زلیخاں کو گہری سوچ میں گم دیکھ کر اسے سمجھانے لگیں۔

"تیرا بھائی اپنی کم ظرف بیوی کی باتوں میں آ گیا ہے۔ بڑا بے عقل ہے سمجھ نہیں ہے اس کو، پر تو فکر نہ کر وقت بڑے بڑوں کو عقل دے دیتا ہے۔ اسے بھی آ جائے گی۔ لے میری دھی یہ دلیہ کھا لے تھوڑا سا۔"

آپاں زہرہ بڑے لاڈ سے اسے دلیہ کھلانے لگیں اور ساتھ اپنی باتوں سے اس کی ہمت بھی بندھانے لگیں۔ پانچ دن ہو گئے تھے اسے آپاں زہرہ کے گھر آئے ہوئے، وہ مسلسل بخار میں پھنکتی رہی تھی اور آج وہ کچھ بہتر ہوئی تھی۔ "میرے مر جانے کے بعد اس کو عقل آئی تو کس کام کی آپاں جی؟" آپاں زہرہ کی بات پہ وہ دکھ سے بولی۔

"آپاں جی ویر تو بہنوں کے مان ہوتے ہیں۔ میرے تو سارے مان توڑ دیئے میرے ویرنے میں اسی مان میں لڑتی رہی لوگوں سے میں ہمیشہ اس کا بھرم رکھتی آئی پنڈ والوں کے سامنے اور اس ویرنے میرا مان میرا بھرم نفرت کی قبر میں دفن کر دیا" اپنے آخرت لفظوں پر زلیخاں پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی۔ آپاں زہرہ نے اسے رونے دیا تاکہ بہت دنوں کا جمع ہوا غبار دل سے نکل جائے۔

"آپاں جی ویر تو بہنوں کا سہارا ہوتے ہیں اور میرے ویرنے اپنے ہوتے ہوئے بھی مجھے بے سہارا کر دیا ہے۔ ویر تو دولت ہوتے ہیں نمانی بہنوں کے اور میرے ویرنے مجھے فقیر کر دیا ہے، خالی ہتھ رہ گئی ہوں میں آپاں جی۔" زلیخاں روتے روتے اب ہچکیوں پر آ گئی تھی اور آپاں زہرہ نے اب بھی اسے

نہیں روکا تھا۔ بس ہولے ہولے اس کا کندھا تھپتھپاتی رہیں۔

....

جسم پر لگنے والی چوٹوں کے زخم زلیخاں کی روح پر ایسے آئے کہ وہ چارپائی سے جا لگی۔ دو مہینے ہو گئے تھے اسے آپاں زہرہ کے گھر آئے ہوئے۔ آپاں زہرہ نے اس کا خیال رکھنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ مگر اس کا بخار ایسا بگڑا کہ اتر ہی نہ سکا۔ آپاں زہرہ نے بہتیرے علاج کروائے، کتنے ہی ڈاکٹروں اور حکیموں کے پاس بھی لے کر گئیں مگر اس بخار نے نہ اترنا تھا نہ اترا، اور زلیخاں دن بہ دن لاغر ہوتی چلی گئی۔ آپاں زہرہ اس کی ماں نہیں تھیں لیکن زلیخاں کے لئے ایک ماں کی طرح تڑپنے لگیں وہ جانتی تھیں کہ زلیخاں کو کون سا روگ اندر ہی اندر کھاتا جا رہا ہے۔ اسی لیے انہوں نے کئی بار گلی محلے کی کئی عورتوں کو رحیم کے لیے پیغام دے دے کر بھجا کہ ایک بار آ کر بہن سے مل جاؤ، لیکن ہر بار چپ کے سوا کوئی جواب نہ آتا۔ آخر تھک ہار کر وہ خود ہی اس کے گھر چلی آئیں۔

''اپنے نام کی کچھ تو لاج رکھ لے، نہ اتنا بے حس اور بے رحم ہو، بیماریاں لگ جائیں تو علاج سے مک جاتی ہیں لیکن اگر اپنوں سے وچھوڑے کے روگ لگ جائیں تے فیر بندہ مک جاتا ہے۔ چل میرے نال اک واری مل لے اس نمانی کو تیری راہ تکتی رہتی ہے۔ حشر کے دن کیا منہ دکھائے گا ماں باپ کو؟ کیا کہے گا ان سے جا کر کہ اک ذمہ داری چھوڑ گئے تھے تجھ پر اور تو نے بیوی کو راضی کرنے کی خاطر وہ بھی نہ نبھائی اور کیسے کیسے دکھ دیئے اس نمانی کو اندر ہی اندر؟ بتا کیا جواب دے گا ان کو حشر کے دن؟'' آپاں زہرہ بول بول کے تھک گئیں مگر رحیم کے لبوں پہ لگا چپ کا قفل نہ ٹوٹا اور نہ ماتھے پہ آئے بلوں میں کمی ہوئی۔ وہ چپ چاپ بیٹھا رہا۔

''اس کو ہم نے گھر سے نہیں نکالا تھا آپاں جی، آپ خود لے کر گئی تھیں، اور اب وہ مرنے پہ آئی ہے تو ہمارے سر ڈالنے آ گئی ہیں۔'' حسب عادت ہاتھ نچا کر بولتی رحیم کی بیوی نے آپاں زہرہ کو جواب دیا۔

''توں چپ کر منحوس ماری، تیرے منہ نہیں لگنے آئی میں۔ اس کا (اس پر زور دیتے ہوئے رحیم کی طرف اشارہ کر کے بولیں) اس بدبخت کا گریباں پکڑنا ہے اس کے ماں باپ نے حشر دیہاڑے، تیرے حساب کتاب تو اللہ جانے اور وہی لے.........'' آپاں زہرہ کا اپنی بیوی پہ تھڑ کنا رحیم کو ایک آنکھ نہ بھایا اور وہ ان کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول پڑا۔ ''اونہیں ہے وہ میری بہن آپاں جی۔ نفرت ہے مجھے اس کی شکل سے اس کے نام سے۔ نہیں لگدی وہ میری کجھ وی۔ مرتی ہے تو مرنے دیں۔ مجھ کوئی پرواہ نہیں ہے۔'' رحیم نے بہت بے دردی سے اپنی بات مکمل کی اور کندھے پر رکھا رومال جھٹکتا ہوا گھر کا داخلی دروازہ پار کر گیا۔

رحیم کی باتیں سن کر آپاں زہرہ کی رہی سہی امید بھی ختم ہو گئی۔ وہ جو یہ امید لے کر آئی تھیں کہ وہ رحیم کو سمجھا لیں گی اس کا دل موم کر لیں گی، اپنی ساری باتیں بیکار جاتی دیکھ کر ہکا بکا رہ گئیں۔ رحیم کا دل اتنا پتھر ہو چکا ہے ان کو یہ امید نہیں تھی۔ ایک بھائی کی ایسی نفرت دیکھ کر ان کا دل کانپ اٹھا تھا۔ وہ رحیم کی بیوی کو ہاتھ اور سر جھٹک کر کمرے کی طرف جاتی دیکھ کے بہت افسوس سے سر ہلا کر رہ گئیں۔ صحن کے بیچوں بیچ کھڑی آپاں زہرہ کی نظر رحیم کی بیٹیوں پر پڑی جو کہ زمین پر بیٹھی کھیل رہی تھیں تو بڑبڑاتی ہوئیں داخلی دروازے کی طرف چل پڑیں۔

''اللہ تمہارے ماں باپ کو ہدایت دے۔ تم لوگوں کو دیکھ کر ہی ان بے عقلوں کو کچھ عقل آ جائے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ رحیم کے گھر کا دروازہ پار کر گئیں اور ٹھیک اسی وقت ''قسمت'' اپنے حساب کی چھڑی لے کر رحیم کے گھر میں داخل ہوئی۔ اور اب اسے تب تک وہاں رکنا تھا جب تک اس کے وار کرنے کا وقت نہیں آ جاتا۔ اور بھلا قسمت کے وار سے کوئی بچا ہے؟

....

''ہائے میں مر گئی، نی دھیے، نی زلیخاں کیا ہو رہا ہے تجھے؟'' آپاں زہرہ جیسے ہی گھر میں داخل ہوئیں، چارپائی پہ زلیخاں کا نحیف و لاغر وجود اکھڑی سانسوں پہ جھٹکے کھاتا نظر آیا تو تڑپ کر اس کی جانب لپکیں، اور چارپائی پر بیٹھ کر اس کا سر اپنی گود میں رکھا اور اس کا چہرہ تھپتھپاتے ہوئے پوچھنے لگیں۔ بوکھلاہٹ میں کچھ سمجھ نہ آیا کہ کیا کریں۔ پھر اس کا سر اپنی گود سے اٹھا کے تکیے پہ رکھا اور چارپائی سے اتر کر پانی کے گھڑے کی طرف گئیں۔ ایک پیالی میں پانی ڈالا اور دوبارہ سے چارپائی کے قریب آئیں۔ پانی کی پیالی زمین پہ رکھ کر چارپائی پہ بیٹھیں اور زلیخاں کا سر پھر سے گود میں لیا۔

''زلیخاں پتر لے پانی پی، اٹھ میری دھی اٹھ شاباشے، لے تھوڑا سا پی لے۔''

آپاں زہرہ نے زمین سے پیالی اٹھائی اور زلیخاں کے منہ کو لگا کے پلانے کی کوشش کرنے لگیں۔

پانی اس کے منہ میں تو نہ گیا لیکن اس کی گردن اور گریبان پر چھلک گیا پھر زلیخاں نے آنکھیں نیم وا کیں اور بڑی آس لیے آپاں زہرہ کو دیکھا۔ جیسے پوچھ رہی ہو کہ.........

''آپاں جی میرا ویر کب آئے گا؟'' آپاں زہرہ اس کی نظروں کی آس کو پڑھ کے سسک اٹھیں۔

''ناں میری دھی تو فکر ناں کر، بس تو ٹھیک ہو جا ماں صدقے۔''

آپاں زہرہ نے ایک کھوکھلی سی تسلی اس کو دی اور گود میں پڑا اس کا سر تھپکنے لگیں۔ اچانک زلیخاں نے بہت اضطراب بھری ہچکی لی اور آنکھیں پوری طرح موند کر اپنا آپ آپاں زہرہ کی گود میں ڈھیلا چھوڑ دیا۔

''نی زلیخاں، نی میری دھی آنکھیں کھول نی پتر، زلیخاں پتر، زلیخاں.........'' زلیخاں کے ڈھیلے پڑے جسم پر آپاں زہرہ بوکھلا اٹھیں اور بڑی بے چینی سے اسے پکارنے لگیں۔

زلیخاں نے آنکھیں تو نہ کھولیں مگر اس کے لب ہولے ہولے ہلنے لگے۔ اس کے حلق سے عجیب غرغراہٹ کی آواز آنے لگی اور پھر آپاں زہرہ نے اس کے منہ سے ہلکی سی آواز میں ''لا'' سنا اور وہ سمجھ گئیں کہ وہ کلمہ پڑھ رہی ہے۔ انہوں نے اس کا سر اپنی گود سے اٹھایا اور احتیاط سے تکیے پر رکھ دیا۔ اس کے ماتھے پہ بوسہ دیتے ہوئے ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور وہ جان گئیں کہ زلیخاں کی زندگی کا سفر اپنے اختتام کو پہنچ گیا۔ زلیخاں نے ایک بار پھر ہچکی لی۔ جسم نے جھٹکا کھایا، لب ہولے سے ہلے، حلق سے ذرا سی ''لا'' کی آواز نکلی اور اس کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا اور زلیخاں کی روح کا پنچھی اس کے جسم کے قفس سے آزاد ہو گیا۔ ''لے نی دھیے آج تیری گل مک گئی، تیرے سارے دکھ مک گئے، تجھے تیرا ویر تو نہ ملا، پر میں جانتی ہوں زلیخاں تجھے تیرا عشق مل گیا ہے۔ زلیخاں کو اللہ مل گیا ہے۔'' آپاں زہرہ اس کی جاں کنی کے عالم میں خاموشی سے آنسو بہاتے کلمہ پڑھ رہی تھیں اب زلیخاں کی چارپائی کے پاس زمین پر بیٹھیں تڑپ تڑپ کے روتے ہوتے کہتی رہیں۔ ''زلیخاں کو اللہ مل گیا۔''

....

دو سال ہو گئے زلیخاں کو مرے ہوئے۔ آپاں زہرہ کے گھر اب بھی ہر جمعرات کو درود پاک کی محفل ہوتی ہے، کھیر بھی پکتی اور بٹتی ہے اس معمول میں کوئی کمی اور کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

اگر کوئی تبدیلی آئی ہے تو زلیخاں کے ویر رحیم کے گھر اور زندگی میں آٹھ مہینے ہو گئے ہیں رحیم ہر جمعرات دودھ کی بالٹی کھیر میں حصہ ڈالنے کی غرض سے آپاں زہرہ کو دینے آتا ہے۔ لیکن آپاں زہرہ کے لب پہ تو جیسے قفل لگ چکے ہیں۔ وہ جیسے ہی رحیم کو دروازے پہ کھڑا دیکھتی ہیں تو بنا کچھ بولے آہستگی سے دروازہ بند کر دیتی ہیں۔ وہ رحیم کو دل سے معاف کر چکی ہیں لیکن بولنے کے لئے ان کے پاس کچھ نہیں بچا۔ اور دودھ کی بالٹی وہ اس لیے نہیں لیتیں کہ ان کے دروازے سے جانے کے بعد رحیم وہ دودھ گلی کے بچوں میں تقسیم کرتا ہے اور ہر بچے کو کہتا ہے کہ دعا کرو زلیخاں مجھے معاف کر دے۔ اور آپاں زہرہ کے لئے یہی کافی ہے۔

آٹھ ماہ پہلے رحیم کی بیوی ایک ایکسیڈنٹ میں دونوں ٹانگوں سے معذور ہو گئی تھی۔ رحیم ابھی اسی حادثے سے نہیں سنبھل پایا تھا کہ اس کی چھوٹی بیٹی جس کی پیدائشی نظر کافی کمزور تھی ایک دن اچانک سیڑھیوں سے گری اور دماغ پر چوٹ آنے سے ہمیشہ کے لئے نظر کھو بیٹھی اور نابینا ہو گئی۔ ان حادثات نے رحیم کی کمر توڑ دی ہے۔ اسے عقل تو آ گئی ہے مگر بہت کچھ گنوا کے۔ اب وہ ہر روز زلیخاں کی قبر پر جاتا ہے اور دیکھنے والے بتاتے ہیں کہ وہ اس کی قبر پہ ہاتھ جوڑے سر جھکائے بیٹھا روتا رہتا ہے لیکن اب اسے نہ صبر آتا ہے نہ سکون ملتا ہے۔

لوگ کہتے ہیں رحیم کو زلیخاں کی بددعا لگی ہے جبکہ آپاں زہرہ یہ بات نہیں مانتیں ان کا کہنا ہے کہ ''وہ نمانی تو آخری وقت تک اپنے ماں جائے کی راہ تکتی رہی۔ اس کی اڈیک میں اس نمانی کے ساہ مک گئے۔'' وہ کہتی ہیں اڈیک رکھنے والے بددعا نہیں دیتے۔ اور قبروں پر بیٹھ کر رونے اور معافیاں مانگنے والے اگر قبر کے اندر کا حال جان لیں تو زندہ لوگوں کے ناں کبھی دل اجاڑیں نہ زندگیاں۔ بددعاؤں سے ڈرنے والے دعا دینے والوں سے منہ موڑنے کا گناہ کبھی نہیں کرتے۔ اور بہنیں تو سراپا دعا ہوتی ہیں۔ بھائیوں کے لئے بھائی بے شک قدر نہ کریں لیکن بہنوں کے دل کبھی نہیں بدلتے۔''

آپاں زہرہ بالکل سچ کہتی ہیں۔ لیکن ایک بات کہنا شاید بھول گئی ہیں۔ بہنیں بے شک بددعا نہیں دیتیں مگر اللہ انصاف ضرور کرتا ہے۔

جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ یہی اللہ سوہنے کا قانون ہے۔ اور کون ہے جو اللہ کے انصاف اور قسمت کے وار سے بچ سکے؟''

افسانہ

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی......

نادیہ احمد بشیر/راولپنڈی

صبا دیکھ رہی تھی کہ نوشابہ آج جب سے سکول سے آئی تھی خاموش تھی۔ کافی دیر دیکھنے کے بعد صبا بولی، کیا بات ہے آج میری گڑیا بہت خاموش ہے؟ کچھ کہا کسی نے؟ تھوڑے تامل کے بعد نوشابہ بولی، مما! آج مجھے ایک ہوم ورک ملا ہے۔ صبا مسکرا دی، لو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے میری بیٹی تو کوئی بھی ہوم ورک کر سکتی ہے۔ مجھے ایک مضمون لکھنا ہے۔"میرے والد"..........

اور اب پریشان ہونے کی باری صبا کی تھی۔ ماضی اس کی آنکھوں کے سامنے ایک فلم کی طرح چلنے لگا۔ یہ بہت سے دوسرے دنوں کی طرح ایک عام دن تھا لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ کتنا خاص ہونے جارہا ہے۔ شیراز صبح حسب معمول دفتر کے لئے تیار ہو کر نکلا اپنے دفتر جانے والی ویگن تک جانے کے لئے گھر کے قریب سے ایک سوزوکی پر سوار ہوا اور حسب معمول سب کو اپنے اپنے مطلوبہ مقامات پر پہنچنے کی جلدی تھی اور حسب معمول ہی سوزوکی مسافروں سے کھچا کھچ بھری تھی، جگہ نہ ہونے کے باوجود کنڈیکٹر نے شیراز کو بہت سے دوسرے افراد کے ساتھ باہر ہی لٹکا لیا۔ شیراز کو بھی تو دفتر پہنچنے کی جلدی تھی سب کچھ ہی تو حسب معمول ہو رہا تھا لیکن پھر جو ہوا وہ بالکل بھی حسب معمول نہ تھا۔ اسی دھکم پیل میں شیراز کا ہاتھ اوپر پکڑے ڈنڈے سے پھسلا اور وہ زور وشور سے جاتی ہوئی سوزوکی سے نیچے آن پڑا۔ اور اسی تیز رفتاری سے اپنی منزل کی طرف جاتی ایک گاڑی اس کے اوپر سے گزر گئی۔ پل بھر میں سارا نقشہ ہی تو بدل گیا۔

شیراز نے وہیں دم دے دیا۔ نہ کوئی کیس چلا نہ کوئی سنوائی ہوئی۔ جسے جانا تھا وہ چلا گیا اسے ایک حادثے کا نام دے کر فائل بند کر دی گئی لیکن یہ حادثہ صبا کی دنیا ویران کر گیا۔ دو زندگیاں جو شیراز سے جڑی تھیں ان کی زندگی مشکل سے مشکل تر ہوتی گئی۔ صبا شیراز کے اس طرح اچانک چلے جانے سے بڑی مشکل سے خود کو سنبھال پائی۔ لاکھ ہاتھ پاؤں مار کر اسے اپنا اور اپنی بچی کا پیٹ پالنے کا ذریعہ ملا اور زندگی چلنے لگی۔ لیکن ایک انسان چلا گیا ایک زندگی ختم ہوگئی ایک خاندان اجڑ گیا، اور ہوا کیا؟ شیراز کی موت سے کیا تبدیلی آئی؟ ٹریفک تو اسی طرح چلتی رہی، سوزوکی اسی طرح کھچا کھچ بھر یجاتی رہی ایک سٹاپ سے دوسرے سٹاپ تک، اور جو ٹریفک سارجنٹ کھڑا ہے وہ "اپنی ڈیوٹی" کرتا رہا، جانے اس نے کبھی سوچا کہ اس کی غلطی، اس کی روپوشی اور نظر انداز کرنے نے کتنی زندگیاں برباد کر دیں؟ ضرورت ہے تو اس تبدیلی کی جو اس طرح کے حادثات کو روک سکے۔ تاکہ مزید زندگیاں برباد ہونے سے بچ سکیں۔ لیکن وہ تبدیلی کہاں سے آئے گی کون لائے گا؟ کیا گورنمنٹ خود آکے ڈیوٹی دے؟ ضرورت ہے تو اس سمجھ کی کہ وہ تبدیلی ہم نے لانی ہے، گورنمنٹ تو سڑکیں بنا دے گی، میٹرو، فلائی اوور، انڈر پاس وغیرہ بنا دے گی، حفظان صحت کے طریقے کر دے گی لیکن اس کو چلانا اس پر عمل کرنا، اس کو آگے بڑھانا ہمارا کام ہے۔ یہ کہہ دینا تو بہت آسان ہے کہ "یہ ملک تو رہنے کے لائق ہی نہیں" لیکن اصل مسئلہ تو ہمارے اندر ہے۔ ساری زندگی گورنمنٹ سے وظیفے پر پڑھنے والا جب ڈاکٹر، انجینئر بن جاتا ہے تو سب سے پہلی کوشش ہی اس ملک سے باہر جانے کی کرتا ہے، ہم اس ملک میں رہ کر یہاں سے پیسہ بنا کر اور آخر اسی ملک کو برا بھلا کہہ کر دوسرے ملکوں میں دوسرے اور تیسرے درجے کے شہری بننے کو ترجیح دیتے ہیں۔ آخر کیوں؟ کیا کوئی نہیں سوچتا کہ جس ملک نے اسے اتنا کچھ دیا ہے اس کا اس پر کوئی حق ہے؟ اس وقت سب خود غرض ہو کر صرف اپنی بھلائی اور اپنا فائدہ سوچتے ہیں۔ لیکن اگر ہر بہتر شخص اسی ڈگر پر چل نکلے گا، اسی راہ کو اپنا لے گا تو اس ملک کا وارث کون ہوگا؟ ہم اپنا ملک جو لاکھوں قربانیوں اور لاکھوں کاوشوں کا نتیجہ ہے وہ کس کو سونپ رہے ہیں؟ کیا وہ ملک اس دن کے لیے وجود میں لایا گیا تھا؟ ہم اپنا ملک کس کے حوالے کر رہے ہیں؟ اگر سب قابل افراد اس ملک سے صرف اپنے مستقبل کو سنوارنے کے لئے نکل جائیں گے تو آخر اس ملک میں رہ کون جائے گا؟ ہر آنے والے سال کے ساتھ دیکھنے میں آیا ہے کہ 14 اگست کی تیاریاں پہلے سے زیادہ زور و شور سے ہونے لگی ہیں۔ اور کچھ اسی دوغلے پن کی تو آتی نہیں کہ ہمیں اپنے ملک سے محبت نہیں، وہاں رہنا ہم نہیں چاہتے، جس جس کو موقع ملتا ہے سب سے پہلے اس ملک سے بھاگتا ہے پھر یہ محبت کے دعوے کیسے؟ پھر جگہ جگہ پرچم کس کو دکھانے کو

لگائے جاتے ہیں؟ ہم کسے دھوکا دے رہے ہیں؟ خود کو؟.......... آج ہمیں اس بات کا شعور ہی ختم ہو گیا ہے کہ جشن آزادی منانے کا اصل مقصد ہے کیا؟ یہ کوئی دکھاوا نہیں کہ جس نے جتنا بڑا پرچم لگا دیا وہ اتنی شان والا ہو گیا یہ ایک عہد ہے ایک عہد کی یاد ہے ایک عہد کا پیاس ہے ایک عہد کا پرچار ہے کہ یہ ملک ہم نے کس لئے حاصل کیا تھا،؟ ہم اس نظریے کا پاس رکھیں گے اسے یاد رکھیں گے اور آنے والی نسلوں کو پہنچائیں گے، لیکن ہم اپنی دوغلی سوچ، دوغلی زندگی اور دوغلی شخصیت کو ہی سمجھ نہیں پاتے۔ جب ہم ہی اپنے ملک کی قدر اور عزت نہیں کریں گے تو کوئی دوسرا کیسے کرے گا؟ ضرورت ہے تو اس سوچ کو بدلنے کی، ضرورت ہے تو اس جذبے کو اجاگر کرنے کی جو علامہ اقبال نے جگایا تھا، ضرورت ہے تو قائد کے اس ملک کو ترقی کی منزلوں کی طرف گامزن کرنے کی۔ ضرورت ہے تو اس تبدیلی کی جو ہر فرد اپنی انفرادی حیثیت سے لائے، تب جا کہ ان لاکھوں قربانیوں کا بدلہ وصول ہو گا۔ تب کسی کو کسی دوسرے کی طرف جانے کی ضرورت نہیں رہ جائے گی۔

ڈور بیل کی آواز نے صبا کو اس کے خیالات سے واپس لایا، وہ چونک گئی کہ جانے کتنا وقت بیت گیا اس نے نوشابہ کی تلاش میں آنکھیں گھمائیں تو وہ سراپا سوال بنی ماں کو تک رہی تھی۔ صبا مسکرا دی ایک نئے جوش اور نئے جذبے کے ساتھ۔ وہ عہد جو اس نے اپنی ذات سے کیا، اس نئی سوچ کی طرف قدم بڑھانے کا۔ خود کو بدلنے کا اور اپنے سے وابستہ افراد کی اس سوچ کی طرف رہنمائی کرنے کا۔ اپنی آنے والی نسل کو صحیح راستے پر چلانے کا۔ پھر صبا نے بہت تسلی کے ساتھ نوشابہ کو بٹھا کے، سمجھا کے ''اپنے والد'' کے بارے میں کچھ سطور پر مشتمل مضمون لکھوایا اور عہد کیا کہ وہ اسے کبھی کمزور نہ پڑنے دے گی اور ہر قدم پر اس کی رہنمائی کرے گی۔ یہ وقت رونے کا نہیں آگے بڑھنے کا ہے اور اپنے ملک وقوم کو صحیح خطوط پر چلانے کا ہے۔ ہر فرد کو اپنی سطح پر بہتری لانے کی ضرورت ہے، ہمارے ملک میں کسی چیز کی کمی نہیں، ضرورت ہے تو صرف تھوڑی سی ''نمی'' کی، دیر کبھی نہیں ہوتی، کسی کو تو بارش کا پہلا قطرہ بننا ہوتا ہے اور بارش کا وہ پہلا قطرہ کتنی اہمیت کا حامل ہے، آپ جانتے ہیں؟

گام گام خواہشیں
ناتمام خواہشیں

ہر خوشی کی موت ہیں
بے لگام خواہشیں

لے ہی آئیں آخرش
زیر دام خواہشیں

ہوش میں نہیں ہوں میں
صبح و شام خواہشیں

کاٹتی ہیں روح کو
بے نیام خواہشیں

عمران شناور/ لاہور

خون کو آنکھ میں پانی کی جگہ رکھتا ہوں
اب طبیعت کو روانی کی جگہ رکھتا ہوں
یاد کو آپ کی یادوں میں نہیں رکھتا میں
آپ کو یاد دھیانی کی جگہ رکھتا ہوں
بس یونہی قافیہ پیمائی نہیں کرتا میں
لفظ لکھتا ہوں تو معانی کی جگہ رکھتا ہوں
تم مجھے ناقص و نادار سمجھتے ہو میاں
میں تو کردار کہانی کی جگہ رکھتا ہوں
خود کو باقی میں تیری قید میں رکھتا ہوں مگر
دل کو میں نقل مکانی کی جگہ رکھتا ہوں

☆☆☆

روزِ ازل سے بس یہ میرا مدعا رہا
یہ عشق میری جان میرا مسئلہ رہا
گرنے نہیں دیا مجھے ہجر و وصال نے
میں ٹوٹ بھی گیا تو میرا حوصلہ رہا
اُس نے کہا یونیک تجربہ کرو کوئی
میں نے کہا میں رات بناتا ہوا رہا
تن کا ملن ضرور تھا دل سے نہ دل ملے
اک چھت کے نیچے رہتے ہوئے فاصلہ رہا
کس عاجزی سے لوگ مجھے مانگتے رہے
دل تھا کہ ایک شخص کی ضد پر اَڑا رہا
اشجار آرزو کے سبھی خشک ہو گئے
حرمان و یاس درد کا جنگل ہرا رہا
اس کے لیے ملا ہے تو ہر اک سے جا بجا
باقی عدو سے بھی تو تیرا رابطہ رہا

اسد علی باقی/ لاہور

افسانہ

بارش اور آنسو

آمنہ نثار

شب بارش اپنے زور وشور سے برس رہی تھی۔ جیسے بارش کا پہلا اور آخری روز ہو۔ بار بار بجلی کی چمک اس کے وجود میں ایک نئے خوف کی لہر پیدا کر دیتی۔ کسی انہونی کا خدشہ لاحق ہو جاتا...... جیسے یہ طوفانی بارش اپنے ساتھ سب کچھ بہا کر لے جائے گی۔ اس کی جھونپڑی کو سر سے اٹھا لے گی اس کا واحد سہارا...... سر چھپانے کی جگہ...... چھت سے ٹپکنے والے پانی کے قطرے جیسے جھونپڑی پر نہیں بلکہ زینت کے دل پر گر رہے تھے۔ بڑے بڑے سوراخ کر رہے تھے۔

وہ بارش جو سب کے لئے رحمت بن کر برستی ہے، باعث مسرت ہے...... وہی بارش زینت کے لئے اذیت بن گئی ہے۔

اسے اپنی تو فکر نہ تھی مگر اس کی تین سالہ بیمار ایمن اسے پریشانی میں مبتلا کئے ہوئے تھی اسے بار بار ایمن کی فکر ہو رہی تھی...... وہ ٹھنڈ سے کانپ رہی تھی...... اس کا پورا وجود بخار سے تپ رہا تھا۔

مگر دوائیاں کہاں تھیں...... یہاں تو بارش تھی...... جو اس کی بیماری میں اضافہ کر رہی تھی...... اور...... زینت کے آنسوؤں میں تھی......!

زینت کبھی بھاگتی جھونپڑی کے سوراخوں سے ٹپکتے پانی کے نیچے کوئی برتن رکھتی...... تو...... دوسری جانب اس کا خیال بار بار اپنی بیماری بیٹی کی طرف جاتا...... تو کبھی جھونپڑی کے ایک کنارے میں لیٹے ہوئے معذور شوہر کی طرف......!

آج ایک جانب بارش زور شور سے برس رہی تھی تو دوسری جانب زینت کے آنسو...... آنسو کہاں...... وہ تو اشکوں کی برسات تھی...... وہ تو بارش پر بھی سبقت لے جانے کی کوشش میں جتے ہوئے تھے۔

مگر اس کے آنسو نہ بارش کو روک سکتے تھے...... نہ...... تکلیفوں سے نکال سکتے تھے۔

مگر ایک آنسو ہی تو تھے جو اس مشکل وقت میں بھی اس کا ساتھ نبھا رہے تھے۔

زینت تھک ہار کر سر تھامے جھونپڑی کے ایک کونے میں بیٹھ گئی جہاں سے ابھی تک پانی ٹپک رہا تھا...... اور بارش کا گلہ شکوہ کرتی رہی......

بارش تو بھی کیا آج ہی برسے گی......؟ میرے صبر کو آزمائے گی......؟

ایک ٹھنڈی آہ بھر کر......!

بارش کا کیا قصور......؟ آخر اس نے تو بلا امتیاز برسنا ہے جھونپڑوں پر بھی اور محلوں پر بھی......

ایک بارش ہی تو ہے جو ہم میں اور امیروں میں فرق نہیں رکھتی...... اور بس......

زینت کے آنسو موتیوں کی لڑی بن کر ایک مالا کی شکل میں ڈھلنے لگے...... ایک ایسی مالا جس میں خوش بو تھی...... نمی تھی...... مگر آنسوؤں کی......!

یاد نہ آئے کوئی......!

سب ہی بھول جاتے ہیں
کون یاد رکھتا ہے۔۔۔؟
دنیا والے کہتے ہیں
کاروبار دنیا میں
کون یاد رہتا ہے۔۔۔؟
مدتوں سے ہاتھوں پر
ایک سی دعائیں ہیں
کاروبار دنیا میں
کاش کوئی اک لمحہ
ایسا بھی کبھی آئے
میں بھی بھول جاؤں اسے
وہ مجھے نہ یاد آئے!!

سمندر کی لہریں

جب آتی ہیں
خوشیاں لے کر آتی ہیں
ساگر کی لہروں میں ایسا جادو ہے
ساحل سے ٹکرا کر جب واپس جائیں
جاتے جاتے سنگ اپنے کچھ رنج وغم
تھوڑا اور بھی ساتھ بہا لے جاتی ہیں
پھر آئیں تو نت نئی خوشیاں لاتی ہیں

عامر بن علی/ جاپان

شاعری

خاص ہو یا یہ عام کہانی
لکھوں صبح و شام کہانی
جو بھی اُلٹا سیدھا بولوں
رکھوں اُس کا نام کہانی
سادہ سی دو چار ہیں باتیں
کون سنائے رام کہانی
پردے اُٹھ جاتے ہیں ایسے
کرتی ہے' بدنام کہانی
اس کی تاثیریں ہیں اپنی
پکی ہو یا خام کہانی
ٹوٹ کے پتھر ریزہ ریزہ
ہو گئے ہیں اصنام کہانی
میرے سب آداب ہیں قصے
تیرے سب پیغام کہانی
شغل دنوں کے بھولے بسرے
راتوں کے آرام کہانی
بھولو ثاقب گزری شامیں
ہو گئے مینا جام کہانی

آصف ثاقب/بوئی ہزارہ

ہم سفر آغاز کتنی دیر تک
سوچ کی پرواز کتنی دیر تک
زرد موسم تو دلوں کے بیچ ہے
رنگ چشم ناز کتنی دیر تک
آرزو اور حسرتوں کے درمیاں
عشق کا اعجاز کتنی دیر تک
جو مٹائے دوریاں اور فاصلے
وصل کا اعزاز کتنی دیر تک
جو امیر شہر کا ہم راز ہے
ہوگا وہ ممتاز کتنی دیر تک
کھل گئی آخر حقیقت آپ کی
پیار کا انداز کتنی دیر تک
آس کیا پہنچے گی اُس تک بھی کبھی
روح کی آواز کتنی دیر تک

آسناتھ کنول/لاہور

یہ آرزو ہے کہ یوں زندگی گزاروں میں
ترے شعور کو احساس میں اُتاروں میں
وہ لمحہ لمحہ اُلجھتا ہے ڈور کی مانند
یہ سوچتا ہوں کہ کیسے اُسے سنواروں میں
سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ پیاس کیسے بجھے
اب اپنی ذات کے دریا کو ہی پکاروں میں
نہیں ہے خواب کوئی اب مری نگاہوں میں
ہر ایک سانس تری یاد میں گزاروں میں
وہ میرے عشق کا حاصل تو تھا مگر شافی
جنوں یہ ہے کہ اُسے جیت کر ہی ہاروں میں

آسناتھ کنول/لاہور

شبِ فراق کو عکسِ وصال کرتی رہی
تمہاری یاد انوکھے کمال کرتی رہی
وہ آئینہ تھا کہ جس نے فضا کو حبس دیا
وہ روشنی تھی جو روشن خیال کرتی رہی
میں جبر زیست کا یوں بھی شکار ہو نہ سکا
دُعا کسی کی مجھے لازوال کرتی رہی
چلے گا موت کا یہ کھیل اور کتنے برس
تڑپتی زندگی ہم سے سوال کرتی رہی
نہ چین دن کو میسر نہ نیند راتوں کو
تری جدائی ہمارا یہ حال کرتی رہی
کسی نے پالیں مرادیں تمام پل بھر میں
کسی کو ایک ہی خواہش نڈھال کرتی رہی
بس ایک پل نہ اُسے یاد کر سکا شاہد
وہ انتظار مرا ماہ و سال کرتی رہی

ہمایوں پرویز شاہد/لاہور

یہی اپنا تعارف ہے ہمارے اے دوست
ہم ہیں سوکھے ہوئے دریا کے کنارے اے دوست
عشق ہو جائے تو الہام بھی ہوتا ہے میاں
عشق میں غیب سے ہوتے ہیں اشارے اے دوست
تم تو خود حسن کا معیار نظر آتے ہو
کیا کوئی شخص تمہیں اور سنوارے اے دوست
سخت مشکل جو پڑی ہے تو پکارا اے تجھے
دوست ہی ہوتے ہیں مشکل میں سہارے اے دوست
اس میں اب شک و شبے کی تو کوئی بات نہیں
ہم تمہارے ہیں، تمہارے ہیں، تمہارے اے دوست
جانے کیوں پھر سے محبت کے لیے نکلے ہیں
ایک ناکام محبت کے یہ مارے اے دوست
ایک آسیب کی صورت ہے یہ ٹھہری ہوئی رات
منجمد وقت کوئی کیسے گزارے اے دوست
ہم تو ایک لمحے میں صدیوں کا سفر کر آئیں
وہ اگر ہم کو محبت سے پکارے اے دوست

پروفیسر مرتضیٰ حسن/سرگودھا

ہم تیرے حسن کو اس دل میں بسا بیٹھے ہیں
عشق کو حاصلِ کونین بنا بیٹھے ہیں

شاعری

کعبۂ عشق ترے در کو بنا بیٹھے ہیں
اس لیے سر کو تیرے در پہ جھکا بیٹھے ہیں
دل سے جس وقت جدائی میں کیا یاد انھیں
دیکھتا کیا ہوں میں وہ سامنے آ بیٹھے ہیں
اک جھلک اپنی دکھا کر سرِ محفل اے دوست
جانے کتنوں کو وہ دیوانہ بنا بیٹھے ہیں
اپنے قدموں میں جگہ دیں گے یقیناً وہ ہمیں
آس یہ مرشد کامل سے لگا بیٹھے ہیں
اُن کی صورت میں خدا جلوہ نما ہوتا ہے
بن کے جو پیکرِ تسلیم و رضا بیٹھے ہیں

اُن کو معلوم ہے منزل پہ بقا کی رفعت
عشق سرکار میں ہم ہو کے فنا بیٹھے ہیں
رفعت علی علوی/لاہور

وہ جو اک پھول ہے پتھر بھی تو ہو سکتا ہے
نرم لہجہ کبھی خنجر بھی تو ہو سکتا ہے
کیا ضروری ہے کہ چاہت میں وہ سینے سے لگے
اس لپٹنے کا سبب ڈر بھی تو ہو سکتا ہے

دور سے پھول جسے آپ نے بھجوائے ہیں
آپ سے مل کے وہ بہتر بھی تو ہو سکتا ہے
ہم جسے آپ کے آنچل کی جھلک سمجھے ہیں
کوئی خوش رنگ سا منظر بھی تو ہو سکتا ہے
کیا ضروری ہے کہ دروازے پہ پتھر ہی لگے
دیکھ باہر ترا نیرؔ بھی تو ہو سکتا ہے
شہباز نیر/رحیم یار خاں

بقیہ انٹرویو: طاہر نسیم

ارژنگ: ادبی گروہ بندیوں کے حوالے سے کچھ کہنا چاہیں گے؟

طاہر نسیم: اختلاف انسانی سرشت کا حصہ ہے مگر یہ بہتری اور تعمیر کے لئے اچھا لگتا ہے مگر جب آدب سے ہٹ کر ذاتی اختلاف کرنے لگتے ہیں تو خرابی شروع ہوتی ہے میں سمجھتا ہوں کہ تخلیق ادب کی معراج اور منشاء انسانیت ہے اور اسی کو ہونا چاہیے عہد گزشتہ میں نامور ادبی شخصیات کی گروہ بندیوں اور اختلافات کا مجموعی طور پر ادب اور ادب سے وابستہ لوگوں کو نقصان ہی ہوا ہے۔

ارژنگ: ادب اور ادیب کی بہتری میں حکومتی اقدامات سے مطمئن ہیں؟

طاہر نسیم: حکومتی سطح پر بہت سے اقدامات کی ضرورت ہے جس طرح موجودہ حکومت اور خاص طور پر وزیر اعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف تعلیمی شعبے کی ترقی کے لئے خصوصی توجہ کئے ہوئے ہیں اسی طرح ادب کے شعبے پر بھی توجہ دیں تو بہتری ہو سکتی ہے صوبائی، ڈویژنل، ضلعی اور تحصیل کی سطح پر لٹریری کی نسلیں تشکیل ہوں وہ مشاعروں، مذاکروں، مباحثوں کا اہتمام کریں تخلیق کاروں کی فلاح کے لئے منصوبہ بندی کریں اور مجھے یقین ہے کہ عطاء الحق قاسمی صاحت کا رول اس سلسلے میں مشعل راہ ہے۔

ارژنگ: آپ نے مرتضیٰ برلاس کے ساتھ مل کر اردو کانفرنس کی کیا اب بھی ایسی کانفرنسز کی ضرورت ہے؟

طاہر نسیم: اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو ہماری قومی او رواحد رابطے کی زبان ہے اگر اس پنائیں گے تو ملک ترقی کرے گا چین اور جاپان کی ترقی کا راز تمام تعلیم ان کی اپنی زبانوں کی وجہ سے ہے مرتضیٰ برلاس صاحب نے پوری زندگی اس کام کے لئے وقف کی انہوں نے خانیوال میں اردو کانفرنس کی سفارشات تیار کیں اور حکومتی حلقوں میں گئیں آج بھی ایسی کانفرنسز کی ضرورت ہے اور مرتضیٰ برلاس صاحب، عطاء الحق قاسمی صاحب، امجد اسلام امجد صاحب اس سلسلے میں اہم اور موثر کردار ادا کر سکتے ہیں۔

ارژنگ: جنوبی پنجاب کے ادبی منظر نامے پر کچھ روشنی ڈالیں گے؟

طاہر نسیم: جنوبی پنجاب میں ادبی اور ادبی صورتحال کافی حوصلہ افزاء ہے شاعروں اور ادیبوں کی کاوشوں کے ساتھ ساتھ سرکاری اداروں کا کردار بھی نمایا اور بہتر رہا ہے عہد حاضر میں جنوبی پنجاب میں خاص طور پر ملتان میں خالد مسعود خان، قمر رضا شہزاد، رضی الدین رضی، شاکر حسین شاکر شاعروں اور ادیبوں کو جوڑنے میں موثر کردار ادا کر رہے ہیں پھر عامر بن علی نے ضلع خانیوال میں ادبی چراغ کو روشن کیا ہوا ہے وہ گاہے گاہے میاں چنوں میں آل پاکستان مشاعروں اور کانفرنسوں کا اہتمام کرتے ہیں ملتان میں ٹی ہاؤس کا قیام بھی خوشگوار حیرت ہے عباس تابش بھی جنوبی پنجاب کا درخشندہ ستارہ ہے۔

ارژنگ: کوئی پیغام جو آپ ارژنگ کے ذریعے دینا چاہیں؟

طاہر نسیم: ہم کہاں کے دانا ہیں کس ہنر میں یکتا ہیں، جی اگر ہم سب ملکر اپنی تخلیقات کے ذریعے بہتری اور تبدیلی لانا چاہتے ہیں تو پھر نئی نسل کو کتاب سے جوڑ دیں ان کے اندر کتب بینی، ادب پروری کو پرو دیں تو شاید مستقبل میں ایک باادب سوسائٹی کا خواب پورا ہوتا دیکھ لیں۔۔۔

نعت شروع زندگی سے ہی میری روح میں سمائی ہوئی ہے

گروہ بندیوں نے ادب کو بہت نقصان پہنچایا ہے

جینوئن تخلیق کار اپنی موت کے بعد بھی زندہ رہتا ہے

جو لطف و سرور درویش کے قدموں میں بیٹھ کر ملا وہ کہیں اور حاصل نہ ہو سکا

محبت کی آفاقیت پر یقین رکھتا ہوں

ارژنگ: شاعری کا آغاز کب اور کیسے ہوا؟

علی رضا: کوئی بھی صلاحیت انسان میں پیدائشی ہوتی ہے۔ لیکن اس صلاحیت کے اظہار کا وقت مقرر ہوتا ہے۔ مجھ میں بھی شعری تخلیق کی صلاحیت موجود تھی اور اس کے باقاعدہ اظہار کا موقع مجھے 85-1984 کے لگ بھگ ملا۔ ساہیوال اور مضافات میں ہونے والی علمی اور ادبی تقریبات میں شرکت نے میرے اس ذوق کو جلا بخشی اور میں نے سب سے پہلے اُردو نعت لکھ کر اپنے شعری تخلیقی سفر کا آغاز کیا اور اللہ کے کرم سے ابتدائی دور ہی میں میری تخلیقات ''فنون''، ''اوراق''، ''تخلیق''، ''ادب لطیف''، ''نیرنگ خیال''، ''ادبیات''، ''محفل''، ''ماہِ نو''، ''شام و سحر''، ''تجدید نو'' جیسے مؤقر اور مستند ادبی رسائل میں شائع ہوتی رہیں۔

ارژنگ: آپ دبستانِ ساہی وال کے اہم شاعر ہیں اور وہاں کے شعرا کے ساتھ آپ کی قربت رہی ہے۔ کچھ یادیں تازہ کریں۔

علی رضا: ساہی وال نے بہت سی قد آور علمی اور ادبی شخصیات کو شناخت دی ہے جن میں مجید امجد، منیر نیازی، اسرار زیدی، ڈاکٹر الف د نسیم، ڈاکٹر خورشید رضوی، ڈاکٹر سہیل احمد خان، فرخندہ لودھی، طارق عزیز، ڈاکٹر سعادت سعید، سعید آسی، ڈاکٹر مہدی حسن اور دوسرے بہت سے افراد شامل ہیں۔ مجھے جو دور نصیب ہوا اس وقت ساہیوال میں جن اہل قلم کی صحبتوں اور نشستوں میں بیٹھنے کی سعادت حاصل ہوئی اور ان سے کسب فیض کرنے کے مواقع میسر آئے ان میں محمد اکرم خان قمر، ڈاکٹر الف د نسیم، جعفر شیرازی، حاجی بشیر احمد بشیر، گوہر ہوشیار پوری، سیّد ناصر شہزاد، راؤ محمود علی محمود، نصیر احمر، سیّد شوکت ہاشمی، ڈاکٹر کاظم بخاری، ذکا اللہ انجم ملغانی، ریاض نغمی، ڈاکٹر جاوید باتش، ایزد عزیز، آفتاب کاوش، سیّد ریاض حسین زیدی، محمد اکرم ناصر، ارجمند قریشی، طالب جتوئی، عبدالرحمان انجم، قسور بٹ، واصف سجاد، غضنفر عباس سیّد، ضیغم رضوی، مرتضٰی ساجد اور ان کے بعد میں آنے والوں میں اوصاف شیخ، افتخار شفیع، افتخار شوکت، حسرت بلال، اسلم سحاب ہاشمی اور دیگر کے نام آتے ہیں۔ میری ان سب سے زبردست ملاقاتیں رہیں اور میں نے ان سب سے بھرپور محبتیں سمیٹیں۔ اس دور کو یاد کرتا ہوں تو میرے چاروں طرف خوشبوئیں پھیل جاتی ہیں۔ غزل کی تخلیق کے حوالے سے جو بھرپور کام ساہیوال میں ہوا ہے اس کی بنیاد پر اس کو ''شہرِ غزل'' کا نام دیا گیا اور یہ ادبی دنیا میں اسی حوالے سے مشہور ہوا۔

ارژنگ: آپ کا نظریہ شعر کیا ہے؟

علی رضا: میں شعر برائے شعر کا ہرگز قائل نہیں ہوں۔ میرا خیال ہے جس شعر میں کوئی پیغام نہیں وہ بے فائدہ ہے۔ شعر کے اندر کوئی سبق یا پیغام ضرور ہونا چاہیے۔

ارژنگ: آپ مشاعروں کی روایت کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ کیا یہ قاری کے ادبی ذوق اور نئے شعرا کی تربیت کے لیے ضروری ہیں؟

علی رضا: ماضی ہی سے مشاعروں کی روایت بڑی مضبوطی اور تواتر سے چلی آ رہی ہے جس نے اہل ذوق کی ادبی تسکین کا سامان بھی پیدا کیا ہے۔ مشاعروں کی اس روایت نے نئے لکھنے والوں کی بھی تخلیقی تربیت کی ہے اور انھیں اس حوالے سے عصری شعور اور عہد موجود کے فنی تقاضوں سے آگاہی بھی دی ہے۔ لمحہ فکریہ ہے کہ موجودہ دور میں سنجیدہ مشاعروں کی روایت زوال پذیر ہوتی جا رہی ہے اور مزاحیہ اور غیر سنجیدہ شاعری کو ہاتھوں ہاتھ لیا جانے لگا ہے۔

ارژنگ: ادب میں گروہ بندیوں کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

علی رضا: ادب میں گروہ بندیاں ہمیشہ ہی سے چلی آ رہی ہیں اور اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ جہاں ان گروہوں نے تخلیقی، علمی، ادبی سطح پر کام کو آگے بڑھایا ہے وہاں ان گروہ بندیوں نے ادب کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ ہر گروہ سے وابستہ افراد اپنے ہونے کے احساس غلط میں بری طرح مبتلا ہیں۔ انھیں اپنے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا اور وہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے اور اپنے سے کمتر ثابت کرنے کے لیے شب و روز مصروف رہتے ہیں۔

ارژنگ: اب تک آپ کی کتنی کتب شائع ہو چکی ہیں اور مستقبل میں کیا تخلیقی کام منظر عام پر آنے والا ہے؟

علی رضا: اب تک میری پانچ کتب شائع ہو چکی ہیں جن میں ''درود انؐ پر سلام انؐ پر'' (نعتیہ انتخاب شاعری) ''مفہوم'' (مجموعہ غزل) ''مردِ خود آگاہ'' (منتخب مضامین)، ''ہمارے ہیں حسینؑ'' (انتخاب سلام) اور ''ثنائے سرورؐ'' (نعتیہ مجموعہ شاعری) شامل ہیں جبکہ مزید تین کتابیں اشاعت کی منتظر ہیں۔ جن میں ''درود انؐ پر سلام انؐ پر'' کا دوسرا ایڈیشن جلد آ رہا ہے۔ جس میں حضرت تابش دہلوی، احمد ندیم قاسمی، حفیظ تائب، ڈاکٹر خورشید رضوی، ڈاکٹر عاصی کرنالی اور دیگر نامور اہلِ قلم کی آرا بھی شامل ہوں گی۔ تقریباً سوا دو سو صفحات پر مشتمل یہ انتخاب نعت اہل علم و دانش سے ضرور پذیرائی حاصل کرے گا۔ میرا دوسرا نعتیہ مجموعہ بھی تکمیل کے مرحلہ میں ہے۔ زندگی نے مختلف شعبوں سے وابستہ شخصیات کے حوالے سے لکھے گئے مضامین، ان سے کیے گئے انٹرویوز جو کہ پچھلے بیس پچیس سال میں قومی اخبارات اور رسائل میں شائع ہوتے رہے ان کے حوالے سے بھی ایک کتاب تقریباً تکمیل کے مرحلہ میں ہے۔ اس مجموعہ میں کئی غیر مطبوعہ مضامین اور انٹرویوز بھی شامل ہیں۔ اُمید ہے یہ کتاب بھی قارئین کی توجہ کا مرکز بنے گی۔

ارژنگ: حال ہی میں آپ کے نعتیہ مجموعے ''ثنائے سرورؐ'' کو حکومتی اور عوامی سطح پر کافی پذیرائی ملی۔ نعت گوئی کی طرف باقاعدہ کب آئے؟

علی رضا: الحمدللہ میرے نعتیہ شعری مجموعے ''ثنائے سرورؐ'' کو اللہ تعالیٰ نے بہت پذیرائی سے نوازا۔ اس پر بہت سے جرائد و رسائل پر تبصرے اور مضامین بھی چھپے۔ اسے عوامی سطح پر بھی بھرپور انداز میں سراہا گیا۔ حکومتی سطح پر بھی اس کی اعلیٰ پیمانے پر تحسین کی گئی اور اس کا اعتراف کیا گیا۔ اس مجموعۂ نعت کو پہلے پنجاب حکومت کی طرف سے اوّل صوبائی سیرت ایوارڈ ملا جب کہ اسی کتاب کو بعد ازاں قومی سیرت ایوارڈ کے لیے منتخب کیا گیا اور صدر پاکستان کے ہاتھوں میں نے اسلام آباد میں یہ ایوارڈ وصول کیا۔ نعت شروع زندگی ہی سے میری روح میں سمائی ہوئی ہے۔ میں نے اپنی شعری تخلیقی کاوش کا اظہار بھی پہلی مرتبہ حضورؐ کی بارگاہ میں نعت لکھ کر کیا تھا۔ اللہ پاک کے فضل سے میری تمام نعتیں حضورؐ سے والہانہ پن اور عشق و سرور کی بے مثل اور دل فریب کیفیات کا ثمر ہیں۔

ارژنگ: بیوروکریسی میں کس قسم کا ادب تخلیق ہو رہا ہے۔ کسی بھی ادیب یا شاعر کو بڑا بنانے میں اس کا عہدہ کیا کردار ادا کرتا ہے؟

جواب: بیوروکریسی اور دیگر شعبوں میں اعلیٰ عہدوں پر تعینات بہت سے ایسے افراد ہیں جو ادب اور شاعری کے میدان میں شہرت کے بام عروج پر نظر آنے کے خواہش مند ہیں اور اس خواہش کی عملی صورت دیکھنے کے لیے وہ اپنے سرکاری اور غیر سرکاری وسائل بھی بروئے کار لاتے ہیں۔ بہت سے چاپلوس اور خوشامدی قسم کے ادیب، شاعر اور دیگر معروف اور نامور افراد ایسے لوگوں کو اپنی تمام تر سروسز بھی فراہم کرتے ہیں اور ان کے خوش فہمی کے اس احساس کو تقویت پہنچانے کا اہم فریضہ بھی انجام دیتے ہیں۔ افسروں کے اس قبیلے کو بہت سے ایسے شاعر ادیب بھی میسر ہو جاتے ہیں جو اُن کی تشہیر کے لیے بہت محنت کرتے ہیں اور اس سلسلے میں اپنی تمام صلاحیتیں بروئے کار لاتے ہیں۔ ان کی خوشنودی اور ذاتی مفادات کے حصول کے لیے ان کے اعزاز میں مختلف پلیٹ فارموں سے تقاریب کا اہتمام کراتے ہیں۔ ان کے فن و شخصیات پر مضامین ایم اے اور ایم فل کے مقالے بھی لکھوائے جاتے ہیں۔ اخبارات و رسائل میں کوریج کی صورت میں ان کے فنی قد و قامت کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرانے کی سر توڑ کوشش کی جاتی ہے۔ حالانکہ اس سے فرق تو پڑتا نہیں کوئی...... میں سمجھتا ہوں کسی سچے اور جینوئن لکھاری کے لیے یہ چیزیں بے معنی ہیں۔ اس کی تخلیق ہی اس کی پہچان ہے۔ کسی تخلیق کار کا سرکاری عہدہ اسے کسی صورت بھی بڑا ادیب یا شاعر نہیں بنا سکتا۔ سرکاری حیثیت یا عہدہ تو اس کی ریٹائرمنٹ تک ساتھ دیتا ہے۔ جب کہ بڑا اور جینوئن تخلیق کار اپنی موت کے بعد بھی زندہ رہتا ہے۔

ارژنگ: ہمارے ادیبوں، شاعروں کا ایک گروہ ملک کے طول و عرض میں تعینات ادیب، دانشور افسران کی تلاش اور تگ و دو میں رہتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟

علی رضا: ہمارے بہت سے نامور شاعروں اور ادیبوں کی ایک بڑی تعداد ایسی بھی ہے جو ہر وقت اس بھاگ دوڑ میں لگی رہتی ہے کہ کون سا ادب دوست اور باذوق افسر کہاں تعینات ہے۔ پھر اس سے رہ و رسم بڑھانے کے بعد اُس سے تعلقات استوار کر کے مفادات اور اغراض حاصل کرنے کا عمل شروع ہوتا ہے۔ یہ سب ''کچھ لو اور کچھ دو'' کی پالیسی کے مطابق ہوتا ہے۔ یہ ادیب اور دانشور ایسے موقعوں پر خوشامد اور چاپلوسی کا بے مثال نمونہ بنتے ہیں۔ لیکن حیرت کی بات ہے جب اُن پر نظر پڑتی ہے تو خودداروں، عزت نفس کے پاسداروں اور انا پسندوں کی صف اوّل میں بھی نظر آتے ہیں۔

ارژنگ: شاعر اور ادیب کو کن خصوصیات کا حامل ہونا چاہیے؟

علی رضا: شاعر یا ادیب کو ایک اچھا انسان بھی ہونا چاہیے۔ علم اور ادب انسان کی تہذیب کا اہم فریضہ بھی انجام دیتا ہے۔ اگر کوئی ادیب یا دانشور اپنے اندر شخصی خوبیاں یا انسانی اوصاف پیدا نہیں کر سکا تو مجھے اس نے علم و دانش سے کچھ حاصل نہیں کیا اور ادبی میدان میں کوئی تیر نہیں مارا۔

ارژنگ: ادب کے فروغ میں رسائل کا کیا کردار ہے؟
علی رضا: ماضی میں ادب کے فروغ میں رسائل کا بڑا بھرپور کردار رہا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے پرچے ''فنون'' ڈاکٹر وزیر آغا کے ''اوراق'' نسیم درانی کے ''سیپ'' طفیل ہوشیار پوری کے ''محفل'' سلطان رشک کے ''نیرنگ خیال'' اظہر جاوید کے ''تخلیق'' ادبیات، ماہِ نو، شام و سحر اور دیگر رسائل کی بے پناہ ادبی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ گو ''اوراق'' ڈاکٹر وزیر آغا کی وفات کے بعد بند ہو گیا اور دیگر بہت سے پرچے بھی مختلف وجوہ کی بنا پر بند ہو گئے لیکن پھر بھی ان نامساعد حالات کے باوجود ''فنون''، ''ادب لطیف''، ''تخلیق''، ''بیاض''، ''ماہِ نو''، ''ادبیات''، ''سیپ''، ارژنگ جیسے رسائل تواتر سے شائع ہو رہے ہیں۔
ارژنگ: کبھی کسی گلوکار نے آپ کی کوئی غزل گائی؟
علی رضا: جی ہاں! میری کچھ غزلیں ریڈیو پاکستان لاہور کے سنٹرل پروڈکشن یونٹ میں مختلف موقعوں پر ریکارڈ کی گئی جنھیں نامور گلوکاروں اعجاز قیصر، غلام عباس، محمد اقبال باہو، علی رضا اور انور رفیع نے گایا۔ اعجاز قیصر کی آواز میں گائی ہوئی ایک غزل ''لمحے ہجر وصال کے'' بہت مقبول ہوئی جو کہ ریڈیو پاکستان کے قومی نشریاتی رابطے پر نشر ہوتی رہتی ہے۔
ارژنگ: اچھی شاعری کی تخلیق میں مضافات کا کیا حصہ ہے؟
علی رضا: مضافات میں ہر دور میں بہترین شاعری تخلیق ہوئی ہے۔ مرکز سے دوری اور نامساعد حالات کے باوجود ساہیوال، چیچہ وطنی، خانیوال، میاں چنوں، وہاڑی، مظفر گڑھ، ڈیرہ غازی خاں، بورے والا، اوکاڑہ، عارف والا، پاک پتن، قصور سمیت دیگر شہروں میں بہت عمدہ شاعری تخلیق ہو رہی ہے۔
ارژنگ: کیا کبھی کسی سرکاری کانفرنس میں بھی شریک ہوئے۔
علی رضا: جی مجھے قومی اور بین الاقوامی سطح پر بھی مشاعروں اور کانفرنسوں میں شرکت کا موقعہ ملا۔ 1994ء میں اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد کے تحت ہونے والی ادیبوں اور شاعروں کی قومی کانفرنس میں مجھے بطور مندوب شریک ہونے کا اعزاز ملا۔ علاوہ ازیں بحرین اور قطر کی ادبی فضا نے بھی مجھے متاثر کیا۔
ارژنگ: کتاب سے آپ کی گہری وابستگی ہے۔ میں نے ہمیشہ آپ کو کتاب کی ترویج اور فروغ کے لیے کوشاں پایا ہے۔ آپ اس کا مستقبل کیا دیکھتے ہیں؟
علی رضا: کتاب کی اہمیت ہر دور میں رہی ہے اور رہے گی۔ انٹرنیٹ اور جدید ٹیکنالوجی کے آنے کے باوجود کتاب کی حیثیت مسلمہ ہے۔
مجھے تقریباً دو سال تک پاکستان ٹیلی ویژن لاہور سے پروگرام ''کتاب'' پروڈیوس کرنے کا اعزاز بھی حاصل رہا۔ جس میں کتابوں پر تبصرے بھی پیش کیے جاتے تھے۔ اعزاز احمد آذر مرحوم اس پروگرام کے میزبان تھے۔ نصف گھنٹے دورانیے کے اس پروگرام میں کسی ایک کتاب کے فنی محاسن پر گفتگو بھی شامل ہوتی تھی۔ صاحب کتاب کے علاوہ دو شخصیات اس پروگرام میں شریک ہوتی تھیں۔ علمی، ادبی موضوعات پر تیار کی گئی بہت سی رپورٹس بھی پی ٹی وی سے نشر ہوئیں۔ میں نے بہت سے جرائد و رسائل میں کتابوں پر تبصرے بھی لکھے۔ اپنے ذرائع سے ان میں تبصرے اور ٹائٹل بھی شائع کروائے۔
ارژنگ: پی ٹی وی میں آپ کی ذمہ داریاں کیا ہیں اور اس ادارے میں بہتری کے لیے آپ کے ذہن میں کیا تجاویز ہیں؟
علی رضا: میں گزشتہ دس بارہ سال سے پی ٹی وی لاہور کے شعبہ حالات حاضرہ میں پروڈیوسر کے طور پر کام کر رہا ہوں اور اس عرصہ میں مختلف نوعیت کے بہت سے پروگرامز پروڈیوس کرنے کا اعزاز بھی مجھے حاصل ہے۔
بہت سارے ٹی وی چینلز کی موجودگی کے باوجود پی ٹی وی نے اپنی انفرادیت قائم رکھی ہوئی ہے اور اس کی اہمیت سے کسی صورت بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ڈراموں کا شعبہ ہو یا ادب کا، تعلیمی میدان ہو یا سیاسی، صحت کا شعبہ ہو یا کھیل کا ہر جگہ پی ٹی وی اپنی بہترین سروسز دیتا نظر آتا ہے۔ پی ٹی وی ایک معتدل چینل ہے اسی بنا پر اسے فیملی چینل بھی کہا جاتا ہے۔ معروف ادبی شخصیت عطاء الحق قاسمی کو بطور چیئرمین پی ٹی وی اس ادارے کی بہتری اور ترقی کے لیے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا چاہیے اور اس ادارے کی قدیم روایات کو پھر سے زندہ کرنے کے لیے اپنا بھرپور کردار ادا کرنا چاہیے۔
ارژنگ: آپ ادبی تقریبات میں کم کم نظر آتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟
علی رضا: مجھے شروع دن ہی سے درویشوں، فقیروں اور دنیاداری کی چمک دمک سے متاثر نہ ہونے والے روشن ضمیر بابوں کے قدموں میں بیٹھنے کے بے شمار مواقع میسر آئے اور ان کی نشستوں میں رہ کر زندگی کو صحیح زاویے سے دیکھنے کے کئی موقعے ملے۔ مجھے طالب علمی کے دور ہی میں صدر پاکستان، وزرائے اعظم اور دیگر اعلیٰ حکام کی موجودگی میں منعقدہ تقاریب میں ہدیۂ نعت پیش کرنے کے بہت سے موقعے ملے اور اب تک ایک معمولی محنت کش، جوتے گانٹھنے والے شخص سے لے کر اعلیٰ افسر تک سے ملاقات بھی رہی لیکن جو سرور اور لطف کھدر کے سلوٹوں والے لباس میں ملبوس درویش کے قدموں میں بیٹھ کر ملا وہ کہیں اور حاصل نہ ہو سکا۔ میرے اسی مزاج نے مجھے ہمیشہ دنیا اور دنیاداروں کی محفلوں سے فاصلے پر رکھا۔ یہی

محرکات ہیں جن کی وجہ سے سیاسی، سرکاری، سماجی، ادبی اور دیگر عوامی محفلوں میں شرکت سے گریز کرتا ہوں اور کافی حد تک اس اجتناب میں کامیاب بھی ہوا ہوں لیکن پھر بھی دوستوں کے اصرار پر مجبوراً کہیں کہیں جانا بھی پڑتا ہے۔

ارژنگ: شعرا کی نئی نسل کے بارے میں یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ وہ سینئرز سے بے نیاز دکھائی دیتی ہے اور صرف اپنی ہی پروجیکشن پر توانائیاں صرف کر رہی ہے۔ کیا یہ تاثر درست ہے؟

علی رضا: سینئرز کی قائم کردہ مضبوط تخلیقی روایات سے صرف نظر کرنا بہتر عمل نہیں ہے۔ سینئرز نے معیاری اور بہترین تخلیقی کام کیا ہے۔ ان کی تخلیقات اور ان کی صحبت سے فائدہ اُٹھانا اور ان سے روشنی حاصل کرنا احسن اقدام ہے۔ جہاں تک اپنی تشہیر کا معاملہ ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ نئی نسل کے شعرا کی ایک بہت بڑی تعداد ہے جو اس تشہیری مہم میں بڑی سرگرم اور متحرک دکھائی دیتی ہے اور راتوں رات شہرت کی بلندیوں کو چھونے کی آرزومند ہے۔ یہاں مجھے سید شوکت ہاشمی کا ایک شعر یاد آ گیا:

نئی لکھاری نسل ہماری جانے کس جلدی میں ہے
صبح کو پیدا ہونے والے شام کو شہرت مانگتے ہیں

ارژنگ: محبت کے بغیر غزل کی شاعری کرنا ممکن نہیں۔ کیا آپ اس تجربے سے گزرے ہیں؟

علی رضا: غزل کی شاعری موضوعات کی وسعت کا نام ہے ان موضوعات میں محبت بنیادی موضوع ہے۔ محبت کے جذبے کے بغیر غزل میں کسی صورت بھی شعریت، چاشنی، بے ساختگی اور اثر پیدا نہیں ہوسکتا۔ محبت زندہ شاعری کی روح کا نام ہے جو محبت نہیں کرتا وہ انسان ہی نہیں ہے اور میں الحمدللہ انسان ہوں اور محبت کی آفاقیت پر یقین رکھتا ہوں۔

ارژنگ: کیا ہماری بیوروکریسی میں بھی اچھے شاعر اور انسان موجود ہیں۔ آپ کن سے متاثر ہیں؟

علی رضا: میری بیوروکریسی سمیت مختلف شعبوں میں تعینات بے شمار افسران سے ملاقاتیں رہیں لیکن سیّد تجمل عباس مرحوم سابق کمشنر اور سیّد شوکت ہاشمی مرحوم سابق ایس ایس پی کے بے پناہ علمی ذوق ادبی اور سماجی خدمت کے بے مثال جذبے نے انتہائی متاثر کیا۔ سیّد تجمل عباس مرحوم نے ڈپٹی کمشنر ساہیوال کی حیثیت سے جناح پبلک لائبریری ساہیوال کی بنیاد رکھی اور اپنی رہائش گاہ پر تین سال تک تواتر سے ربیع الاول کے مقدس مہینے کی مناسبت سے کل پاکستان نعتیہ مشاعروں کی روایت کو یقینی بنائے رکھا۔

ان مشاعروں میں ہر سال ایک شاعر کو بذریعہ قرعہ اندازی حج بیت اللہ کی سعادت کے حصول کے لیے بھی بھیجا جاتا رہا۔ انھوں نے غریب اور نادار شاعروں اور ادیبوں کی مالی اعانت کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور بے گھر ادیبوں دانشوروں کو پلاٹ بھی دیے۔ ان کے بے روزگار بچوں کو ان کی اہلیت کے مطابق مختلف محکموں میں ملازمتیں دلوائیں اور دیگر فلاحی اور سماجی اسکیموں کو مکمل کروایا۔ شاہ صاحب ایک اعلیٰ افسر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بڑے انسانی مرتبے پر بھی فائز تھے جن کے اندر انسانیت کا درد بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ سیّد شوکت ہاشمی مرحوم بھی ایک باکمال انسان تھے۔ پولیس کی وردی میں ایک درویش اور اُجلا انسان...... ساری زندگی شاعری تخلیق کی اور پندرہ بیس مجموعہ ہائے نعت، سلام، غزل اور قطعات نذر قارئین کیے۔ انھوں نے کافی بھی لکھی اور اس کا بھی ایک مجموعہ اہل ادب کو دیا۔ سیّد شوکت ہاشمی نے بطور ایڈیشنل ایس پی ساہیوال فروغ علم وادب کے لیے بہت سے عملی اقدامات کروائے۔ انھوں نے مجھ ناچیز سے مل کر اس وقت کے ایم این اے میاں انوار الحق رامے سے گزارش کر کے مجید امجد اکیڈمی ساہیوال کی بنیاد رکھی اور عارضی باڈی تشکیل دے کر اس پر کام شروع کرایا۔ بعدازاں مجھے اس سے الگ ہونا پڑا۔ کیوں کہ اس میں کچھ غیر ادبی، سیاسی اور غیر متعلقہ عناصر کی شمولیت اور ان کی مداخلت کا عمل شروع ہوگیا تھا۔ شوکت ہاشمی مرحوم کی بھی وہ دلچسپی نہ رہی اور وہ بھی اس صورت حال کی وجہ سے اجتناب برتنے لگے تھے۔ بعدازاں مختلف شہروں میں ان کی تعیناتی سے ان سرگرمیوں سے اُن کی دلچسپی اور بھی کم ہوگئی تھی۔ سیّد شوکت ہاشمی کی شعر اور ادب دوستی کا ایک قابل ذکر پہلو یہ بھی ہے ان کے پاس میں نے ملک بھر سے بہت سے ایسے شاعروں، ادیبوں کو آتے جاتے دیکھا جن کا ان سے تقاضا ہوتا کہ ان کی کتب کی نکاسی اور فروخت کے سلسلے میں ان سے معاونت اور ان کی مدد کی جائے۔ میری چونکہ ان سے بہت قربت تھی اور میرا تسلسل سے اُن سے ملاقاتوں کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ لہٰذا ایسے بہت سے واقعات کا میں عینی شاہد ہوں۔ میں نے دیکھا بیرون شہر سے آنے والے بڑے بڑے نامور اور ایوارڈ یافتہ شاعر، ادیب بھی اُن کے ذریعے سے اپنی کتابیں بکواتے رہتے اور اس حوالے سے اُردو کے ایک سینئر اور بڑے شاعر کو میں نے انھیں اپنی جیب سے ادائیگی کرتے ہوئے بھی دیکھا۔

ارژنگ: ارژنگ کے لیے کوئی پیغام؟

علی رضا: قارئین کے لیے میرا یہی پیغام ہے کہ محبتوں کو فروغ دیں اور معاشرے سے نفرت جڑ سے اُکھاڑ دیں۔ علم وادب کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ اپنے اندر مثبت قدروں کو جگہ دیں اور دوسروں کے لیے خیر خواہی کے جذبے کو عام کریں۔

مختصر ادبی خبریں/تقریبات

حلقہ دارالادب کا ماہانہ مشاعرہ

حلقہ دارالادب کا ماہانہ مشاعرہ کاہنہ میں منعقد ہوا۔ مشاعرے کی صدارت امین سندھو نے کی۔ جبکہ مہمان خصوصی رانا نیر اقبال (گوجرانوالہ) تھے۔ نظامت کے فرائض محمد اقبال پیام نے سرانجام دیے۔ اس مشاعرے میں کاہنہ اور دوسرے علاقوں سے شعرا نے شرکت کی۔ مشاعرے کے اختتام سے قبل ادبی تنظیم دارالادب کے صدر محمد افضل راہی اور نائب صدر محمد اقبال پیام نے اظہار خیال کرتے ہوئے اس عزم کا اظہار کیا کہ وہ اس تنظیم کے پلیٹ فارم سے مشاعروں اور دیگر تقاریب کا اہتمام کرتے رہیں گے۔ محمد اقبال پیام نے کہا محمد افضل راہی نے کاہنہ میں ادبی فضا کا جو پودا لگایا تھا وہ آج سرسبز گھنا درخت بن چکا ہے۔ تقریب کے اختتام پر شعرا و سامعین کے لیے ضیافت کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔

کل پاکستان محفل مشاعرہ بسلسلہ جشن بہاراں

شاعری معاشرے کی بقا میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اسی طرح مشاعرے نہ صرف کسی معاشرے میں محبت و یگانگت کے ضامن ہوتے ہیں بلکہ علم و آگہی کے فروغ کا بھی باعث ہوتے ہیں۔ مشاعرے تہذیب کے نمائندہ اور ثقافت کے علم بردار ہوتے ہیں۔ اسی سلسلے میں ضلع سرگودھا کی تحصیل بھلوال کے ڈاکٹر عبدالقدیر ہال ٹی ایم اے میں ایک خوبصورت محفل مشاعرہ کا اہتمام سکالرز لٹریری فورم بھلوال نے کیا اور اس مشاعرے کے انتظام کی تمام تر ذمہ داریاں پروفیسر ارشد جبار پراچہ صدر سکالرز لٹریری فورم بھلوال نے بخوبی انجام دیں۔ مشاعرے کی صدارت ملک کے نامور شاعر، ادیب، دانش ور جناب منو بھائی نے کی۔ جن کا کسی علمی و ادبی محفل میں ہونا ہی اس محفل کی کامیابی کی دلیل ہے۔ مشاعرے کی نظامت و نقابت کے فرائض پروفیسر تفاخر محمود گوندل نے سرانجام دیے۔ مشاعرے کے آغاز میں بھلوال کے باذوق سامعین نے جناب منو بھائی صاحب کا ہال میں کھڑے ہو کر پرتپاک استقبال کیا اور مہمانِ خصوصی ملک کے نامور شاعر جناب عباس تابش صاحب تھے۔ اعزازی نشست پر معروف شاعر فرحت عباس شاہ تشریف فرما تھے۔ دیگر مہمانانِ اعزاز میں جناب ندیم محبوب، کمشنر سرگودھا، جناب ثاقب منان، ڈی سی او سرگودھا، جناب ڈاکٹر ظہیر الحسن ڈوگر، وائس چانسلر یونیورسٹی آف سرگودھا۔ جناب کنور اقبال طالب، ایم ڈی نون شوگر ملز لمیٹڈ اور جناب نوید اختر آر ڈی نون شوگر ملز لمیٹڈ شامل تھے۔ شعرا کرام میں جناب قمر رضا شہزاد، جناب رانا سعید دوشی، جناب ڈاکٹر ارشد معراج، جناب فاروق طراز، جناب ڈاکٹر احسان گھمن، جناب شاکر کنڈان، جناب ڈاکٹر شفیق آصف، جناب مولوی اسلم، جناب سیّد قاسم شاہ، محترمہ سعدیہ صفدر سعدی، محترمہ طاہرہ سرا، محترمہ فرح شاہ، محترمہ ثمینہ گل، جناب قاسم خیال، جناب عمران عامی، جناب ذوالفقار احسن، جناب نعیم رضا بھٹی، جناب اصغر حسین شامی، جناب افضل گوہر، جناب عاطف وحید یاسر، جناب صابر علی صابر، جناب خواجہ ناصر ادیب، جناب تفضیل شیرازی، جناب طاہر فردوس، جناب رؤف ایاز اور سرفراز ضیا نے اپنا اپنا کلام پیش کیا۔ مشاعرے کا آغاز تلاوت قرآن پاک سے ہوا۔ تلاوت کی سعادت شاہد محمود کے حصے میں آئی۔ جب کہ نعت رسول مقبول پیش کرنے کا اعزاز بھی شاہد محمود کو ہی ملا۔ اس کے بعد منتظم مشاعرہ پروفیسر ارشد جبار پراچہ نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

ادبی تنظیم روش انٹرنیشنل ساہیوال کے زیر اہتمام محفل مشاعرہ

گزشتہ دنوں فعال ادبی تنظیم روش انٹرنیشنل ساہیوال یونٹ کے زیر اہتمام چیئرمین تنظیم محمد افضال حسین سہروردی کی رہائش گاہ واقع طارق بن زیاد کالونی ساہیوال میں جشن آزادی کے سلسلہ میں ایک محفل مشاعرہ منعقد ہوئی جس کی

صدارت محقق، نقاد اور شاعر پروفیسر ڈاکٹر افتخار شفیع نے کی۔ مہمانِ خصوصی قومی سیرت ایوارڈ یافتہ شاعر اور پی ٹی وی لاہور کے پروڈیوسر علی رضا تھے۔ جبکہ مہمانانِ اعزاز میں شمشیر حسین زاہد اور اللہ یار ثاقب تھے۔ نظامت کے فرائض محمد فاروق اظہر نے ادا کیے۔ تقریب کا آغاز تلاوت قرآنِ مجید سے ہوا۔ جس کی سعادت محمد افضال حسین سہروردی کے حصہ میں آئی۔ نعت رسولِ مقبولؐ پیش کرنے کا اعزاز علی رضا کو ملا۔ یومِ آزادی کے سلسلے میں منعقد ہونے والے اس مشاعرہ میں جن شعرائے اکرام نے اپنا کلام پیش کیا اُن میں ڈاکٹر افتخار شفیع، علی رضا، خالق آرزو، حسرت بلال حسرت، کاشف حنیف، بلال اعظم اور محمد فاروق اظہر کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ اس تقریب کے دوران معروف گلوکار ملک احتشام الحق نے ملی نغمہ پیش کر کے خوب داد وصول کی۔ جبکہ اللہ یار ثاقب نے اپنی گفتگو میں کہا کہ ہمیں چاہیے کہ ہم آزادی کی اس نعمت کو غنیمت جانیں اور ملک و ملت کی قدر کریں اور محبِ وطن پاکستانی ہونے کا ثبوت دیں۔ تقریب کے آخر میں محمد افضال حسین سہروردی نے ملکی ترقی اور استحکام کے لیے دعا کروائی۔ تقریب کے اختتام کے بعد پُرتکلف کھانے کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔

عامر شہزاد صدیقی کے اعزاز میں شعری نشست

ملتان میں مقیم نامور کالم نویس اور سیاسی و سماجی شخصیت عامر شہزاد صدیقی کے اعزاز میں بزمِ انمول کے زیر اہتمام اکادمی ادبیات لاہور کے دفتر میں ایک شعری نشست کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت شاعر اور سفر نامہ نگار حسن عباسی نے کی۔ مہمانانِ خصوصی معروف شاعر توقیر شریفی تھے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر دانش عزیز نے ادا کیے۔ مشاعرے میں کثیر تعداد میں شعرا و سامعین نے شرکت کی اور ہر اچھے شعر پر دل کھول کر داد دی۔

اُجاگر اور زندہ قوم کی محفل مشاعرہ

ادبی تنظیم ''اُجاگر'' اور روزنامہ ''زندہ قوم'' کے زیر اہتمام آئی بی ایل کالج فیصل ٹاؤن لاہور میں ایک محفل مشاعرہ انعقاد پذیر ہوئی۔ صدارت ملک کے نامور شاعر جناب نذیر قیصر نے کی۔ مہمانانِ خصوصی ڈاکٹر عامر شہزاد، حسن عباسی اور شاہدہ دلاور شاہ تھے۔ مہمانِ اعزاز اسد باقی اور وقاص عزیز تھے۔ نظامت کے فرائض روزنامہ ''زندہ قوم'' کے مدیر اور خوب صورت شاعر ندیم اظہر ساگر نے ادا کیے۔ لاہور کے علاوہ دیگر شہروں سے آئے ہوئے شعرا نے بھی اس محفل مشاعرہ میں شرکت اور اپنے خوب صورت اشعار سے حاضرین کے دل جیت لیے۔

بزمِ چغتائی کا ماہانہ مشاعرہ

بزمِ چغتائی کا ماہانہ مشاعرہ گرائمر اسکول اعوان ٹاؤن میں منعقد ہوا۔ صدارت ممتاز شاعرہ حمیدہ شاہین نے کی۔ جبکہ مہمانانِ خصوصی عنبرین صلاح الدین اور حرا رانا تھیں۔ نظامت کے فرائض خواجہ عامر نے نہایت شگفتگی سے ادا کیے۔ اس محفل مشاعرہ میں لاہور کے علاوہ دیگر شہروں سے بھی شعرا نے شرکت کی۔ اتوار کے روز صبح کے وقت معتبر شعرا کی شرکت اس مشاعرے کی روایت اور کامیابی کی دلیل ہے۔ نامور فکشن رائٹر ایم اے راحت بھی خصوصی طور پر اس میں تشریف لائے مشاعرے کے بعد ضیافت کا اہتمام تھا۔

پاکستان سوشل کلب عمان کے زیر اہتمام ایک تقریب

گذشتہ روز مسقط کے مقامی ہوٹل میں پاکستان سوشل کلب عمان کے زیر اہتمام ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا جس میں پاکستان سوشل کلب کے چیئرمین میاں محمد منیر، اور جنرل سیکرٹری محمد زعیم اور ڈائریکٹرز پاکستان سوشل کلب، اسلم نواب چوہدری محمد عباس ،عبدالرحمن گلو نے شرکت کی۔ تقریب میں پاکستان سوشل کلب عمان کے لٹریڑی ونگ کے صدر منتخب ہونے پر مشہور شاعر اور افسانہ نگار ناصر معروف کو گلدستہ اور تقریری سرٹیفکیٹ پیش کیا۔ تقریب سے اظہار خیال کرتے ہوئے ناصر معروف صاحب نے اس عزم کا اعادہ کیا وہ لیٹریری ونگ کے صدر کی حیثیت سے اپنی تمام تر توانائیاں بروئے کار لائیں گے اور ثقافتی، اور ادبی سرگرمیوں کو فروغ دیں گے۔ تقریب کے دیگر شرکا میں سابق ڈائریکٹر پاکستان سوشل کلب سلیم اختر، پاکستان سکول مسقط کے سابق چیئرمین شبیر احمد ندیم، پاکستان سکول مسقط کے ڈائریکٹر چوہدری اصغر، محمد رضوان، یوتھ ٹیلنٹ ونگ کے ہیڈ محمد وسیم، نائب صدر پاکستان سوشل کلب برائے لٹریری ونگ مقبول شیخ، چوہدری عاطف اور پاکستان کمیونٹی کے دیگر معززین نے شرکت کی۔

تبصرۂ کتب/فلیپ/آراء

نام کتاب: ہونگاہِ کرم/ شاعر: عمران مفتی/ صفحات: 128/ قیمت: 300 روپے/ تبصرہ نگار: ڈاکٹر اجمل نیازی
ناشر: نستعلیق مطبوعات، لاہور

عشق رسول ﷺ کے اپنے مقام پر موجود مفتی عمران خان نے اپنے دل کو غارِ حرا کہا تو یہاں عشق رسول ﷺ کی محبت میں سرشار پرندے بھی اُترتے ہوں گے۔ ان دیکھی دنیاؤں کے یہ فرشتے کوئی سرگوشی بھی کرتے ہوں گے۔ عمران کی نعت اسی سرگوشی کا خلاصہ ہے۔ یہ محبت کا ایک الہام ہے جو کسی ناقابل بیان انعام کی طرح اُسے ملا ہے۔ نعت ایک نعمت ہے جو عشق کرنے والوں میں سے کسی کسی کو ملتی ہے۔ عشق رسول ﷺ کے راستے میں نعت کہتے ہوئے یہ سب کچھ اُسے عطا ہو چکا ہے۔ یہ عشق رسول ﷺ کی پہلی برکت ہے اور آخری برکت بھی یہی ہے ان دونوں برکتوں کے درمیان کوئی لمحہ ہوتا ہے جو نعتیہ شاعری کا سلیقہ ہوتا ہے۔ یہ بھی تو ایک محبت کا قرینہ ہے کہ عمران کی غزل پر نعت کا گماں ہوتا ہے اور نعتیہ شاعری میں بھی غزل کا کوئی رنگ جھلک دکھاتا ہے۔ نعت کا یہ شعر اُٹھا کے غزل میں رکھ دیں تو اجنبی نہیں لگتا۔ مجھے لگتا ہے یہ سب شاعری عمران نے دل کے غارِ حرا میں بیٹھ کر لکھی جہاں تنہائی کی گہرائی کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ انسان اپنے آپ سے ہم کلام ہوتا ہے۔ ہم کلامی اور خود کلامی میں فرق مٹ جاتا ہے۔ عمران نے نعتیہ شاعری یا غزلیہ شاعری دونوں سچے دل سے لفظوں کی آنکھوں میں رکھ دی ہے۔ اس کے لفظ دیکھتے بھی ہیں اور یہ تو آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ کیسے دیکھتے ہیں۔ اس مشاہدے نے اسے ایسا تخلیقی تجربہ عطا کیا ہے جو عمران کو محبت کرنے والوں کی پہلی صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔ اس کے آگے مقام صرف امامت کا ہے مجھے یقین ہے یہ مقام بھی اُسے کبھی ملے گا کہ وہ شخصیت کی شفافیت کا ایک پیکر ہے۔ اسے مل کر سرخوشی ملی ہے اور یہ خوشی سے اگلا مقام ہے میں نجانے کس مقام پر کھڑا ہو کر اس کا استقبال کر رہا ہوں۔ رفاقت اور ہم سفری محبت کے راستے کا سب سے بڑا اجر ہے۔ اور یہ اجر عشق کی آخری منزلوں پر ابھی نہ پہنچ سکنے کی کیفیت میں صبر کی طرح ہے۔ اللہ اسے اجر عظیم بنائے۔

نام کتاب: پہلی پیشی/ مصنف: ناصر بشیر/ صفحات: 176/ قیمت: 300 روپے/ تبصرہ نگار: مجیب الرحمٰن شامی
ناشر: کتاب ورثہ، فیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ناصر بشیر زیادہ اچھے شاعر ہیں یا نثر نگار...... غزل میں تو انھوں نے اپنا نقش جمایا ہی تھا، نظم میں انھوں نے مولانا ظفر علی خاں کی پیروی کر کے دکھا دی ہے۔ حالات حاضرہ پر روزانہ نظم لکھتے اور روزنامہ "پاکستان" کے قارئین سے داد پاتے ہیں۔ وہ مشکل سے مشکل زمین میں بڑی آسانی اور روانی کے ساتھ شعر کہہ سکتے ہیں۔ انھوں نے دو برس پہلے رمضان المبارک کے مہینے میں ہر روز نعت لکھ کر دربارِ رسالت مآب ﷺ میں حاضری کی سعادت حاصل کی۔ اور پھر رودادِ سفر ایک نئے جذبے اور شوق سے لکھ ڈالی۔ اس سفرنامے کی ایک ایک سطر اور ایک ایک لفظ سے گواہی ملتی ہے کہ یہ ایک مقدس سفر کا کوئی روایتی روزنامچہ نہیں ہے۔ اسے بجا طور پر ایک زندہ اور شگفتہ روداد کہا جا سکتا ہے جو پڑھنے والوں کو اپنی طرف کھینچتی اور ان کے دلوں میں وہ آتش شوق بھڑکا دیتی ہے جو دیارِ رسول ﷺ میں پہنچ کر ہی سرد ہو سکتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ جس طرح ان کے نعتیہ اشعار بارگاہِ رسالت ﷺ میں باریاب ہوئے تھے، ان کی یہ نثری نعت بھی شرف قبول حاصل کرے گی اور ان کے لیے دنیا و آخرت میں آسودگی کا سامان فراہم ہوگا۔

نام کتاب: زندگی بسر کرنے کا نبوی ﷺ سلیقہ/ ترجمہ و ترتیب: علامہ زاہد محمود قاسمی/ صفحات: 192/ قیمت: 290 روپے
ناشر: بیکن بکس، غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور

شیخ الاسلام ابوالعباس احمد بن عبدالحلیم بن تیمیہ جوحران میں ۶۶۱ھ میں پیدا ہوئے اور دمشق میں ۷۲۸ھ میں فوت ہوئے۔ آپ ؒ عقیدۂ توحید کی تعلیم و تبلیغ اور

بدعات کی تردید میں اپنے مضبوط موقف اور ثابت قدمی اور اپنی کثیر علمی تالیفات وتصنیفات کی وجہ سے ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ آپ ؒ نے اپنی اس کتاب کا نام قرآن کریم کی آیت ''اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُهٗ'' (اسی کی طرف پاکیزہ کلمات بلند ہوتے ہیں اور عمل صالح بھی اسی کی طرف بلند ہوتا ہے) سے اخذ کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۱۴ء میں برلن سے چھپی۔ اس کے بعد قاہرہ میں مطبع منیریہ کی طرف سے متعدد بار علمائے ازہر میں سے ایک بزرگ عالم الشیخ محمد الناجی العسوی کی تصحیح وتخریج کے ساتھ چھپتی رہی۔ ۱۳۴۹ھ میں اسی مصری نسخہ کا عکس المکتبۃ القیمہ بھنڈی بازار بمبئی سے بھی شائع ہوا۔ پھر اس کی ایک اشاعت شیخ ناصر الدین البانی اور الشیخ محمد زہیر الشاویش المیدانی دمشقی کے اہتمام سے ۱۳۸۵ھ میں سامنے آئی لیکن علامہ ناصر الدین نے اس کتاب کے متن میں سے کافی چیزیں اپنی صوابدید پر حذف کرا دیں جس کے بعد ابن تیمیہ ؒ کی یہ مفید عوام وخواص کتاب اپنی اصل شکل سے محروم ہوگئی۔ الحمد للہ بیکن بکس نے پاکستان میں پہلی بار اس مبارک کتاب کو اپنے اصل و مکمل متن کے ساتھ معہ اُردو ترجمہ شائع کرنے کی سعادت پائی ہے۔ یہ کتاب اکسٹھ ابواب اور دو سو ترپن احادیث پر مشتمل ہے۔ لگتا یہ ہے کہ مؤلف ؒ کے پیش نظر یہ تھا کہ مسنون دُعاؤں اور اذکار کی ایک ایسی کتاب وجود میں آئے جو بغیر کسی اضافی بحث وتفصیل کے لوگوں کو صرف اور صرف مسنون دُعائیں واذکار مہیا کر دے تاکہ وہ انھیں حسب موقعہ بے تکلف عمل میں لائیں۔ اسی لیے مؤلف نے عنوانات کے حسن پر خاص توجہ دی اور اس کے تحت بغیر کسی اور چیز کی مداخلت کے احادیث کی نصوص دے دیں۔ ایسی کتابیں دُعاؤں اور اذکار کے پڑھنے والوں کے لیے بہت مفید ہوا کرتی ہیں۔ چنانچہ اس کتاب کے بعد بہت ساری کتابیں اسی انداز میں مرتب کی گئیں اور کئی علمائے کبار نے اذکار ودعاؤں کے لیے از سر نو کوئی کتاب مرتب کرنے کے مقابلے میں علامہ ابن تیمیہ کی اسی کتاب کی تشریح وتوضیح لکھ کر شائع کرنے کو ترجیح دی۔ اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا تو ہم ان میں سے کسی اہم اور مفید ترین شرح کو اُردو قالب میں ڈھال کر اُردو خوان دوستوں کے لیے پیش کریں گے۔ مزید تفصیل کتاب کے مقدمہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔

نامنام کتاب: صدائے رباب/شاعر: سیدہ رباب حیدر/صفحات: 136 / قیمت: 400 روپے/تبصرہ نگار: عقیل محسن نقوی
ناشر: ماوراء-60 دی مال، لاہور

سیدہ رباب حیدر کا دربارِ عقیدت میں پہلا سجدہ بیعتِ ظالم سے انکار کی تصدیق ہے۔ حمد، نعت، منقبت، سلام پر مبنی کتاب ''صدائے رباب'' اللہ اور اُس کے سچے رسول ﷺ کی بھرپور گواہی کے ساتھ ساتھ آلِ رسول ﷺ سے مودّت کی منہ بولتی تصویر ہے۔ دربارِ آلِ محمد ﷺ میں پیش کیے جانے والے الفاظ میں شعوری کاوش کم اور روحانی الہام کا عکس زیادہ واضح دکھائی دیتا ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ لکھنے والے کو شہرت، داد، ہوسِ نام سے کوئی خاص کام نہیں ہے۔ اُسے تو صرف رحمت، شفاعت، بخشش، صراط، اجر وثواب اور نجات سے مطلب ہے اور اس غرضِ خاص کے تحت اُس نے خود کو فنا فی الحسین کرنے کی کوشش کی ہے۔ میرے نزدیک یہی جذبہ اُس کی عاقبت کی آرائش کا ضامن ہے۔ امامِ زمانہ اُس کے اس جذبے کو مزید توانائی عطا فرمائیں۔ آمین

نام کتاب: میری آنکھوں میں کتنا پانی ہے/شاعر: جبار واصف/صفحات: 208 / قیمت: 500 روپے/تبصرہ نگار: باقی احمد پوری
ناشر: ماوراء-60 دی مال، لاہور

بہت سے شاعر محض شاعر ہوتے ہیں اور عملی زندگی سے دور کسی خواب نگر میں رہنے والے ہوتے ہیں لیکن اس کے برعکس جبار واصف اپنے معاشرے سے، اپنے اردگرد کے لوگوں سے، اپنے عزیز واقارب سے اور دوستوں سے جڑا ہوا ایک بہت ہی متحرک شاعر ہے جس کی شاعری اُس کی اپنی عملی زندگی کی تصویر کشی کرتی ہے۔ اُس کی شاعری کسی سیاسی جیالے کی ہنگامی شاعری نہیں جو چند روز بعد فلاپ ہو جاتی ہے۔ جبار واصف کی شاعری مستقبل میں بھی زندہ رہنے والی شاعری ہے۔ کیونکہ یہ معاشرے کے پسے ہوئے مظلوم طبقات کی نمائندگی کرتی ہے۔ غزل ہو یا نظم جبار واصف کی سوچ کے زاویے مختلف ہیں۔ اُس کے موضوعات جداگانہ، اُس کا اسلوب نگارش منفرد اور اس کا لہجہ کاٹ دار ہے۔ پُر تاثیر، سادہ ہے۔ جو کسی غریب کی جوان بہنوں کی شادی کے بوجھ کو اپنا بوجھ سمجھتا ہو، جو دخترِ حوا کی تقدیس کا علمبردار ہو، جو نظامِ جبر کے ہاتھوں غریب شہر کی آہیں سن کر تڑپ اُٹھتا ہو، جو معذور بچوں کے دکھ درد کو محسوس کر کے ان کے ساتھ کچھ وقت بھی گزارتا ہو، وہ جبار واصف ہی ہو سکتا ہے۔ جبار واصف کی شاعری میں سطحی رومانوی اشعار دیکھنے میں نہیں آتے، اس کے ہاں عشق ومحبت کا اظہار بھی ایک پُروقار انداز سے ہوتا ہے۔ بلاشبہ وہ ان قلیل اور باشعور شعرا میں شامل ہے جو عروض اور رموزِ شاعری کو بھی سمجھتے ہیں۔ رحیم یار خان ادبی فورم کے بانی وصدر کی حیثیت سے جبار واصف کی ادبی وسماجی خدمات کو بھی نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ میری نیک تمنائیں ہمیشہ اپنے اس پیارے دوست کے ساتھ ہیں۔

نام کتاب: گوہر ملسیانی شخصیت وفن/مصنف: سبط جمال پٹیالوی/صفحات: 329/تبصرہ نگار: صبیح رحمانی
ناشر: دارالنوادر، الحمد مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور

''گوہر ملسیانی شخصیت وفن'' میں سبط جمال نے بڑی خوبی سے اپنے ممدوح کی شخصیت کے نمایاں پہلوؤں کو اُجاگر کیا ہے اور ان کے مختلف الجہات علمی اور ادبی کاموں پر تحقیقی اور تنقیدی بصیرت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ اس طرح سبط جمال پٹیالوی نے ہمارے معاشرے میں اہل علم کی طرف سے بے التفاتی اور ناقدری کی روشن کا کچھ ازالہ کر دیا ہے۔ ''گوہر ملسیانی شخصیت وفن'' پیش کر کے سبط جمال نے پوری ادبی دنیا کی طرف سے بالعموم اور نعتیہ ادب کے تخلیق کاروں، تنقید نگاروں اور تحقیق کے مردان کار کی جانب سے بالخصوص ایک فرضِ کفایہ بھی ادا کر دیا ہے۔

نام کتاب: اللہ میں صبر کروں گی!/مصنف: اظہر محمود شیخ/صفحات: 94/قیمت: 80روپے/تبصرہ نگار: ناصر محمود شیخ
ناشر: نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد

یہ کتاب اپنی نوعیت کی منفرد اور اچھی کاوش ہے۔ اس کتاب کے ذریعے اظہر محمود شیخ نے خصوصی افراد اور مستقل بیماریوں، تھیلیسیمیا، ہیموفیلیا کے شکار بچوں کی نہ صرف حوصلہ افزائی کی ہے بلکہ ان کی صلاحیتوں کو نمایاں کرنے اور انھیں خراج تحسین پیش کرنے کی بھی اچھی کوشش کی ہے۔ ہماری زندگی کا اہم سے ضروری سوال ہے کہ ہم دوسروں کے لیے کیا کر رہے ہیں؟ بقول مولانا ابوالکلام آزاد ''اگر تم صرف اپنے لیے زندہ ہو تو اس کا مطلب یہی ہے کہ تم اپنی قوم کے لیے زندہ لاش ہو۔'' اظہر محمود نے بڑے خلوص اور محبت سے اپنا وقت خصوصی افراد اور تھیلیسیمیا اور ہیموفیلیا کے شکار بچوں کو دیا ہے۔ ان کے لیے آسانیاں پیدا کرنے کی سعی کی ہے اور انھیں مثبت کاموں کی طرف راغب کر کے انھیں مصروف رکھنے کی کوشش کی ہے۔

نام کتاب: ایسا مسلم ہوں میں/شاعر: راجا وقاص افضل/صفحات: 128/قیمت: 300روپے/تبصرہ نگار: حسن عباسی
ناشر: کتاب میلہ، اُردو بازار لاہور

بہت کم کتب ایسی ہوتی ہیں جو بیک وقت مختلف موضوعات کا احاطہ کیے ہوئے ہوں۔ زیر نظر کتاب ''ایسا مسلم ہوں میں'' بھی اُن میں شامل ہے جس میں تعمیری و اصلاحی مضامین بھی شامل ہیں۔ مختصر افسانے بھی ہیں اور شاعری بھی...... تمام تخلیقات کا مقصد انسان کی صحیح سمت میں تربیت اور نشوونما ہے۔ راجا وقاص افضل عام روش سے ہٹ کر منفرد سوچ کے مالک ہیں۔ زندگی اور زندگی کے تمام شعبوں سے متعلق اپنا الگ نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ اُن کی سوچ، مولوی کی سوچ اور سطحی علم رکھنے والے شخص کی سوچ میں بہت فرق ہے۔ وہ انسان کو ایسا مسلم بنانا چاہتے ہیں جو انسانیت کی ہر تعریف پر پورا اُترتا ہو۔

نام کتاب: ملاقاتیں اور باتیں!/شاعر: محمد صابر عطا/صفحات: 112/قیمت: 250روپے/تبصرہ نگار: عبداللطیف ابوشامل
ناشر: دستک پبلی کیشنز، ملتان

سیدھا سادہ سا جوان، نظریں جھکائے، دھیمے لہجے میں اپنا مدعا بیان کرنے والا اور گفت گو کرنے سے زیادہ سننے والا، خاکساری اور عاجزی میں گندھا ہوا یہ جوان جو صابر بھی ہے اور عطا بھی۔ وہ اپنے نام کا عکس ہے۔ اس سے جب میری ملاقات ہوئی تھی تو میں اسے نوآموز سمجھا تھا، جو مجھ جیسے عامی سے راہ نمائی کا طلب گار تھا لیکن محمد صابر عطا چھپا رستم نکلا۔ وہ ایک صحافی ہے، خلق خدا کے دکھوں میں گھلنے والا، کچھ کر گزرنے کی دھن اس پر سوار ہے اور وہ اپنی راہیں نکال رہا ہے۔ اس نے بنے بنائے راستے پر سفر کرنے کی بجائے اپنا راستہ خود بنایا ہے۔ بے ساکھیوں سے آپ چل تو سکتے ہیں لیکن دوڑ نہیں سکتے۔ وہ دوڑنا چاہتا ہے اس

لیے وہ کسی بھی طرح کی بے ساکھیوں سے بے نیاز ہے۔ اس نے اظہار اور مکالمے کا ہر ذریعہ اپنانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ شاعری اظہار کا مؤثر ذریعہ تو ہے لیکن اس وادی خارزار میں قدم رکھنا اور پھر اس پر ثابت قدمی سے آگے کا سفر کرنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں ہے۔ اس وادی میں وہی سرخرو ہوتے ہیں جو حوصلہ رکھتے ہوں، عزم رکھتے ہوں اور پھر صلہ و ستائش سے بے پرواہو کر پیہم سفر کریں۔ بدنصیبی سے ہمارے ہاں شاعری کے نام پر الفاظ کی اُلٹ پھیر ہو رہی ہے۔ شاذ و نادر ہی کوئی نیا خیال نئے آہنگ کے ساتھ طلوع ہوتا ہے۔ اس نئے آہنگ میں صابر عطا بھی ہے۔ ''جوگی پہلے منتر سمجھے'' اس کا پہلا مجموعہ ہے جو سرائیکی زبان میں ہے۔ یوں بھی سرائیکی اتنی مٹھاس لیے ہوئے ہے کہ انسان شاد ہوئے بنا نہیں رہ سکتا لیکن اس مٹھاس میں جو دکھ، محرومیاں ہیں وہ اس زبان کو مزید دل سوز بناتی اور چاشنی بخشتی ہیں۔ صابر عطا جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور وڈیروں کے جبڑوں میں پھنسی ہوئی دکھی، مقہور، مغضوب، معتوب، لاچار و بے بس خلق خدا کی آواز بننے کے مراحل طے کر رہا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ اپنا سفر جاری رکھے گا اور منزل پر پہنچ کے دم لے گا۔ اس کی دوسری کتاب ''ملاقاتیں اور باتیں'' جو کہ انٹرویوز اور مضامین پر مشتمل ہے آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس نوجوان کا یہ کام بھی اس کی بہترین صلاحیتوں کا عکاس ہوگا۔

نام کتاب: اک تیری تصویر نہیں/ شاعر: عبدالستار رازؔ/ صفحات: 128 / قیمت: 250 روپے/ تبصرہ نگار: پروفیسر عبدالعزیز پرواز
ناشر: زربفت پبلی کیشنز، لاہور

عبدالستار رازؔ کی شاعری میں شعورِ زیست کے ساتھ ساتھ عرفانِ ذات بھی موجود ہے۔ ان کے کلام میں آشوبِ زمانہ کی جھلک نظر آتی ہے۔ مادیت کی روشنی نے جس نفسانفسی کی فضا کو جنم دیا ہے اس کی ان الفاظ میں عکاسی محل نظر ہے۔ وطن عزیز میں معاشیات کی غلط تقسیم کے حوالے سے ان کے قلم سے نکلے ہوئے الفاظ اپنے اندر لحہ فکریہ کا سامان رکھتے ہیں۔ کچھ ایسے قلبی تاثرات کے حوالے سے میں کہہ سکتا ہوں کہ موصوف عبدالستار رازؔ صاحب سرزمین نارووال کے ایک اُبھرتے ہوئے شاعر ہیں۔ ان کا اندازِ سخن ماشاء اللہ ان کی منفرد شناخت قائم کرنے میں کامیاب ثابت ہوگا۔ اگر فکر سخن اور قلم و قرطاس کا سلسلہ اسی تن دہی سے جاری رہا تو عزیزی عبدالستار راز بہت جلد حلقہ اربابِ ذوق میں اپنا مقام پیدا کرلیں گے۔ بلاشبہ عبدالستار رازؔ انسانی زندگی کے تنوعات سے بزمِ سخن کو آراستہ کرتے ہیں۔ وہ عام جذبوں کے ترجمان ہیں۔ وہ ایک تہذیب یافتہ، وضع دار شخصیت کے مالک ہیں۔ اُمید ہے کہ وہ اپنی وضع داری کا تاثر ہمیشہ قائم رکھیں گے۔

نام کتاب: پیار کی پہلی بارش/ شاعر: افتخار شوکت/ صفحات: 128 / قیمت: 500 روپے/ تبصرہ نگار: عطاء الحق قاسمی
ناشر: نستعلیق مطبوعات، فیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

پاکستانی معاشرے اور کلچر کی جو خوبیاں مجھے پسند ہیں ان میں یہاں کی شاعرانہ ادبی فضا بھی ہے۔ ہر شخص ایک خاص شاعرانہ مزاج رکھتا ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ اگر ان کا مزاج پوچھا جائے تو اس میں سے بیشتر شاعر نکل آتے ہیں۔ اس بھیڑ میں اچھے شعرا کی بھی کمی نہیں۔ مجھے آئے روز جو شعری مجموعے ڈاک میں ملتے ہیں ان میں سے زیادہ تر مجموعوں کی شاعری منفرد تو نہیں البتہ اچھی ضرور ہوتی ہے۔ ''پیار کی پہلی بارش'' کی شاعری مجھے منفرد بھی لگی ہے اور اچھی بھی۔ اس کی شاید ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ طویل ریاضت کے بعد منظر عام پر آئی ہے۔ افتخار شوکت نے عام نوجوانوں کے برعکس پہلے مجموعے کی اشاعت میں تاخیر کر کے ایک اچھی روایت قائم کی ہے۔ آسان زبان میں زندگی کے مختلف موضوعات کو نہایت سلیقے اور ہنر مندی سے اشعار کا روپ عطا کیا ہے۔ ہر غزل میں شاعر کا اندر بکھرا ہوا ہے۔ تغزل جو کہ اُردو شاعری کا طرۂ امتیاز ہے وہ اس میں موجود ہے۔ افتخار کی شاعری میں یکسانیت نہیں ہے وہ اپنے آپ کو دہراتا نہیں ہے۔ اس کی غزل میں کئی رنگ ہیں اور ان رنگوں کے کئی شیڈز ہیں۔ افتخار شوکت کی شاعری مجھے پسند آئی ہے۔ میں اسے ''پیار کی پہلی بارش'' کی اشاعت پر دل کی اتھاہ گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اس کا یہ شعری سفر اسی خوبصورتی کے ساتھ جاری رہے۔ آمین

کتاب: پورا اکھراں دا/ شاعر: احسان فیصل کنجاہی/ صفحات: 144 / قیمت: 350 روپے/ تبصرہ نگار: نازاو کاڑوی
ناشر: مکتبہ فجر بخ پیر روڈ نیو مزنگ لاہور

احسان فیصل دا ایہہ پہلا پنجابی پراگا اے۔ پڑھیا تے سواد وی آیا۔ اک تے خالص پنجابی اکھراں دا ورتارا فیر مُدھ توں لے کے اج دے نویں سے دے مطابق اپنیاں غزلاں تے نظماں وچ عمدہ خیال پیش کیتے نیں۔ احسان فیصل نے شاعری دے سارے لوازمات دا خیال رکھیا اے۔ دکھو دکھ بحراں ورت کے اپنے شاعر ہون دا ثبوت دتا اے۔ کتے کتے نکی بحر ورت کے اپنی قابلیت دس وچ وی کامیاب رہیا اے۔ اک شعر دی ونگی ویکھو۔ بندیاں نالوں چنگے ہوندے...... سپاں کولوں ڈر یا نہ کر
مینوں اُمید اے ایہہ شعری پراگا تہانوں وی ضرور پسند آئے گا۔

نام کتاب: آخری پھول/ مصنف: گل زیب عباسی/ تبصرہ نگار: نازاو کاڑوی
ناشر: مکتبہ فجر بخ پیر روڈ بنوں مزنگ لاہور

گل زیب عباسی میدان ادب کا پرانا شاہ سوار ہے اُردو پنجابی دونوں زبانوں پر عبور رکھتے ہوئے غزل، نظم، نثر کو اپنا ذریعہ اظہار بناتے ہوئے ادب تخلیق کرنے میں مصروف ہے۔ اس سے قبل اُردو غزل، پنجابی غزل، نظم، کہانی کے ساتھ ساتھ دو افسانوں مجموعہ اپنے قارئین کی نظر کر کے پسندیدگی کی سند لیتے ہوئے حالیہ افسانہ مجموعہ ''آخری پھول'' کے نام سے اپنے چاہنے والوں کے سامنے پیش کیا ہے۔ بے شک لکھنے کا انداز عام اور سادہ ہے لیکن موضوعات سے خوب انصاف کرتے ہوئے افسانہ نگاری کی ہے۔ اس مجموعے میں پڑھنے والوں کے لیے بھر پور مواد ہے جو پڑھنے والوں کے ذہنوں کو سیراب کرے گا۔ مجھے اُمید ہے گل زیب عباسی کا یہ افسانوی مجموعہ بھی قارئین کی توجہ حاصل کرنے میں ضرور کامیاب رہے گا۔

نام کتاب: روشن کرنیں/ شاعر: صدام ساگر/ صفحات: 64 / قیمت: 80 روپے/ تبصرہ نگار: سرور ارمان
ناشر: مکتبہ فجر بخ پیر روڈ نیو مزنگ لاہور

سرور ارمان لکھتے ہیں کہ ''صدام ساگر کی یہ نظمیں مذکورہ بالا تمام صفات سے لبریز ہیں۔ وہ آسان اور سادہ اسلوب میں بچوں کی ذہنی سطح کے عین مطابق چھوٹی نظمیں کہتے ہیں۔ جو ان کے معصوم اور زرخیز ذہنوں میں ہمیشہ محفوظ ہو جانے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔
وہ با مقصد شاعری پہ یقین رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں مقصدیت اور رجائیت پائی جاتی ہے اور ان کی نظمیں کسی قسم کا بوجھل پن پیدا نہیں کرتی۔ یہ وہ نقطہ ہے کہ جو بچوں کے لیے کی گئی شاعری میں مرکز و محور کی حیثیت رکھتا ہے۔

نام کتاب: جے میں بولاں/ شاعر: منیر چشتی/ صفحات: 196 / قیمت: 500 روپے/ تبصرہ نگار: نازاو کاڑوی
ناشر: مکتبہ فجر بخ پیر روڈ نیو مزنگ لاہور

کتاب ''جے میں بولاں'' منیر چشتی ہوراں دی اک وکھری تخلیق اے۔ منیر چشتی ہوراں اپنے شاعر ہون دا حق ادا کر دیا ہویاں حالات حاضرہ نے دل کھول کے شاعری کیتی اے۔ کہیا جاندا اے ناپٹی شاعر سماج دی اک اکھ ہوندا اے جو اوہ ویہندا اے اوہ اپنے اکھراں راہیں سماج دے کئیں پاتے اکھاں اگے جیندی جاگدی مورت سامنے رکھ دیندا اے۔ منیر چشتی ہوراں ہر اُس موضوع نوں چھویا اے جو اسیں روز ویکھدے آں تے چپ رہندے آں پر چشتی ہوراں بندیاں نوں اپنی شاعری راہیں ہلایا اے۔ منیر چشتی ہوریں اپنے مقصد وچ کامیاب رہے نیں۔ ایہہ پنجابی شعری مجموعہ ضرور لوکائی نوں پسند آئے گا۔ آخر تے پنجابی زبان ماں بولی واسطے ایہناں دا اک شعر ویکھو۔ ماں بولی نوں عار نہ سمجھیں...... پھلاں تائیں خار نہ سمجھیں۔

نامہ ہائے احباب

برادرم حسن عباسی! آپ کے لیے عکس صادق نمبر تلاش کرنے میں بڑی کوشش کرنا پڑی۔ میرے پاس میرے ریکارڈ کا ایک رسالہ تو تھا مگر اسے ارسال کرنا ممکن نہ تھا۔ بہرکیف ایک کاپی مل گئی ہے بھیج رہا ہوں۔

مجھ پر ایک کتاب میرے شاگرد نے ''گوہر ملسیانی شخصیت وفن'' مرتب کی تھی۔ وہ بھی شامل ہے۔ لکھنا دشوار ہے ہاتھ ساتھ نہیں دیتا۔ پھر بھی چند چیزیں لکھ کر بھیج رہا ہوں کمپوزر جواب دے گیا ہے۔

فقط

گوہر ملسیانی/خانیوال

خدا آپ کے حُسن کو دوبالا کرے۔ ''ارژنگ'' اپنی جملہ حشر سامانیاں لے کر رونق افروز ہوا ہے۔ آپ کی ادارتی سلیقگی لائق داد ہے۔ چونکہ آپ اور عامر بن علی خود پائے کی موزوں گویوں میں اسم رکھتے ہیں اس لیے ارژنگ میں شاعری بھی کمال کی ہوتی ہے۔ خالد شریف اور منصور آفاق کے انٹرویو اپنے اپنے رنگ کے ہیں۔ منصور آفاق طرز جدید کے علم بردار ہیں۔ اسی ''حساب'' سے ان کی گفتگو بھی ''حیران'' کر دینے والی ہوتی ہے۔ خالد شریف کے خیالات ان کی ''محتاط روی'' کی عکاسی کرتے ہیں۔ برسوں پہلے خالد شریف ایبٹ آباد میں افسر ہو کر آئے تھے۔ ورائٹی بک سٹال پر اُن سے ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ کتابوں کی نمائش میں ان کے ساتھ میری تصویر بھی ہے۔ ابن انشا انہی وقتوں ایبٹ آباد آئے تھے۔ ٹاؤن ہال میں پروفیسر صادق زاہد (مرحوم) نے ایک مشاعرے کی صدارت اُن سے کرائی تھی۔ اس میں خالد شریف نے بھی تازہ کلام سنایا تھا۔ خوب داد سمیٹی تھی۔ یہ اور بات کہ وہ اپنے کسی انٹرویو میں ''ایبٹ آباد'' کو یاد نہیں کرتے۔ ارژنگ کی تحریریں ''معمول'' کے مطابق ہیں۔ مضامین اور افسانے بھی اچھے شاعری بھی مزے کی۔ خدا آپ کو اور عامر بن علی کو سلامت رکھے۔ ارژنگ میں آپ کی تازہ بتازہ تصویریں اور دیگر لوازم دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ خدا آپ کو اور ہمیں خوش رکھے۔

خیر اندیش

آصف ثاقب/بوئی ہزارہ

جناب حسن عباسی صاحب!

رواں سال کو احمد ندیم قاسمی کے نام معنون کیا گیا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے حوالے سے ایک تحریر برائے ارژنگ ارسال خدمت ہے۔

''سائیں'' کے حوالے سے مضمون ابھی تک مجھ پر قرض ہے۔ کچھ ناگزیر مصروفیات اور پریشانیوں نے بری طرح سے اُلجھائے رکھا۔ توقع ہے کہ بہت جلد یہ کام بھی پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گا۔

فقط

احمد جلیل/اوکاڑہ

برادرم حسن عباسی صاحب! تسلیم۔ مزاج عالی؟ ''ارژنگ'' کا تازہ شمارہ ملا۔ آپ نے مجھے اس لائق سمجھا۔ بہت ممنون ہوں۔ اس شمارے کے تمام مندرجات میرے لیے نہایت سودمند رہے۔ سب سے بڑی خوشی اس بات کی ہے کہ آپ نے تسلسل کے ساتھ اس عمل کو جاری رکھا ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ کو صحت اور سلامتی کی دولت سے نوازے۔

ڈاکٹر افتخار شفیع/ساہیوال

مکرمی حسن عباسی صاحب! تسلیم۔ مزاج عالی ''ارژنگ'' کا جولائی کا شمارہ ملا۔ آپ کو وصولی کی اطلاع دینے میں قدرے تاخیر ہو گئی۔ میں نے اس شمارے کے مندرجات کو تفصیل سے دیکھا ہے۔ اس میں شامل سبھی لوگ میرے اعتبار کے ہیں۔ اللہ کرے جلتا رہے دیا جو روشن ہے۔

خدائے محمد آپ اور آپ کے اہل خانہ کو شاد باد رکھے اور آپ کی ہر خواہش پوری ہو۔

ڈاکٹر افتخار شفیع/ساہیوال

جناب حسن عباسی صاحب! آداب

اُمید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ تقریباً مئی 2016 کا شمارہ موصول ہوا تھا۔ اس کے بعد مجھے یاد نہیں کہ میں نے کوئی لیٹر لکھا تھا یا نہیں۔ نہ ہی کوئی رسالہ موصول ہوا۔ پھر میں خود بیمار ہو گئی۔ پتے کا آپریشن ہوا۔ یوں کوئی مزید خط نہیں لکھ سکی۔ اب کچھ لکھنے پڑھنے کی سرگرمیاں شروع کیں تو ''ارژنگ'' کی کمی محسوس ہوئی۔ تو جناب کبھی کبھی درشن کروا دیا

کریں۔ ایک چھوٹی سی کہانی ارژنگ کے لیے اور ایک غزل پیشِ خدمت ہے۔ خوش رہیے

آسناتھ کنول/ لاہور

قابلِ احترام برادرِ محترم حسن عباسی صاحب!

اسلام علیکم۔ ارژنگ کے لیے مناقب و سلام ارسالِ خدمت ہیں۔ اگر محرم الحرام کے شمارے میں گوشہ لگوا دیں تو مہربانی ہوگی۔ سب کو سلام

طالبِ دعا

ندیم نیازی/ نبی

جنابِ حسن عباسی صاحب!

اسلام علیکم۔ اُمید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ حاضر ہو ملاقات نہ ہو سکی۔ بہر حال اس ماہ کے ''ارژنگ'' کے لیے غزلیں دے جا رہا ہوں۔ براہ کرم ایک خبر بھی لگا دیجیے گا کہ عقیل شافی کی نئی کتاب مناقب آلِ رسولؐ چہار یار امہات المومنین ''تارے عربی چمن دے'' نام سے فجر پبلی کیشنز کی طرف سے شائع ہو گئی ہے۔ رابطہ عقیل شافی۔

عقیل شافی/ لاہور

حسن عباسی بھیا! اسلام علیکم۔

ماہنامہ ''ارژنگ'' آپ کی محبتوں کے جلو میں باقاعدگی سے مل رہا ہے اور ماشاء اللہ بہتر تر ہوتا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی توفیقات میں مزید اضافہ فرمائے۔

یومِ آزادی کے سلسلہ میں ایک نظم بعنوان ''ست'' اور ایک تازہ غزل ارسال کر رہا ہوں۔

مدثر تحسین/ چیچہ وطنی

میرے اپنے بھائی حسن عباسی صاحب!

اسلام علیکم۔ ارژنگ منفرد رسالہ ہے۔ اس کے ہر صفحہ پر انفرادیت کی چھاپ ہے۔ یہ ایک خاص ادبی رسالہ ہے اور اس کا مواد جمع کرنے میں آپ بہت محنت کرتے ہیں۔ کیونکہ اس کے مطالعے سے قاری کی سیری ہو جاتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نئی صدی میں ہمارا ادب داخلی انتشار کے سبب فکری کم مائیگی سے دوچار ہے۔ آج کا انسان اجتماعی صداقتوں کی تلاش میں بھٹک رہا ہے۔ بے اعتنائی نے اور بے معنویت نے خدوخال بدل دیے ہیں۔ سوچنے سمجھنے اور فکر کی جگہ ذات کی تسکین زیادہ اہم ہو گئی ہے۔ جب انفرادی عمل کے تعین میں دشواری ہو تو پھر اجتماعی تعقل کے ذریعے تخلیقی عمل کس طرح شروع کیا جائے۔ ادب کے بحران پر غور کرنے کے لیے بھی تخلیقی اور انسانی قدروں کو تلاش کرنا پڑے گا۔ ادب کو شعور کی حرارت اور نیا خون دے کر ہی تخلیقی عمل کو توانائی مل سکے گی۔ پاکستان اور ہندوستان میں تخلیقی اعتماد اور اعتبار کی اتنی بھی کمی نہیں ہے کہ تخلیقی وجود کی صداقتوں کا سراغ نہ مل سکے۔ آج کا شاعر اور ادیب باطنی صداقت کو اپنے وجود کے حوالے سے تلاش کر کے اپنی ذات کو اجتماعی تجربوں میں ملا دینے کے لیے کوشاں ہے۔ عامر بن علی اور حسن عباسی بھی اسی قافلے میں شامل ہیں۔

ارژنگ ہر لحاظ سے منفرد ہے۔ جس سے نئی صدی کی ادبی نمائندگی مناسب انداز سے ہوئی ہے۔

دستگیر شہزاد

ٹوبہ ٹیک سنگھ

برادرم حسن عباسی جی! السلام علیکم۔

اُمید رکھتا ہوں خیریت سے ہوں گے۔ دو غزلیں ارسال کر چکا ہوں اُمید رکھتا ہوں کہ قریبی اشاعت میں شامل کر لیں گے۔ تازہ غیر مطبوعہ حمد ارسال کر رہا ہوں قبول فرمائیں۔ اُمید ہے جلد ملاقات ہوگی۔ بیٹے ذیشان کو گلے کا مسئلہ ہے چیک کروانا ہے۔ آپ محبت کرتے ہیں مولا آپ کو مزید عزت شہرت اور کامیابیوں سے نوازیں آپ نے ہمیں اپنی لسٹ (پیار کرنے والوں کی) میں شامل کر لیا۔ یہ آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے۔ باقی ملنے پر۔

نیاز مند

امجد شریف/ گوجرانوالہ

آپ کی جانب سے ارسال کردہ ماہنامہ ارژنگ کا شمارہ ماہ جولائی 2016 ملا۔ یاد رکھنے کا بہت شکریہ! ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔ جو نظر سے گزر گیا وہ بہت خوبصورت انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ باقی شمارہ تمام کر کے تبصرہ کروں گا۔ ایک چیز لکھی ہے یہ میری کاوش عام سے انداز میں ہے۔ پتہ نہیں آپ کے معیار پر اُترتی ہے یا نہیں۔

میری زندگی کے دکھوں کا کیا پوچھتے ہو
دامن کو جھٹک سکتے نہیں راہِ پرخار سے
اپنوں نے لوٹا غیروں نے نوچا
ہم کو تو مارا جی نے کیا پوچھتے ہو
خواہشوں چاہتوں سے شروع سفرِ زندگی کیا
اک لغزشِ پا نے ستم توڑا کیا پوچھتے ہو
آغازِ سفر نے انجامِ سفر بنایا
ڈوبی ناؤ کنارے پر کیا پوچھتے ہو

فقط

محمد ذوالفقار

ممتاز ادیب اور مزاح نگار

حافظ مظفر محسن

کی طنز و مزاح پر مشتمل کتاب

"بونا نہیں بے وقوف"

کا چوتھا ایڈیشن شائع ہو گیا ہے

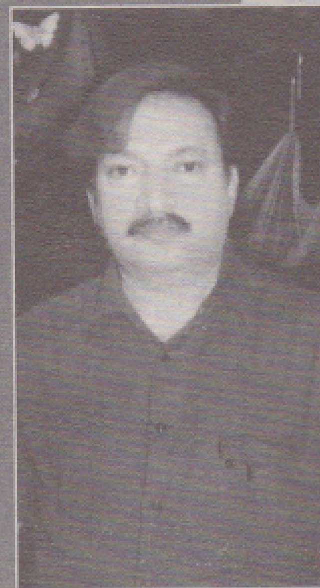

طنز و مزاح کے اکھاڑے میں لنگوٹ کس کے اُترنا اتنا آسان کام نہیں جتنا نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دیگر اصناف ادب کے برعکس بہت کم لوگوں نے اس صنف کے ساتھ پنجہ آزمائی کی کوشش کی۔ جو میدان میں اُترے اُن میں سے بھی بیشتر اس صنف کو پچھاڑنا تو درکنار اس کی "وِیٹی" پکڑنے میں بھی کامیاب نہیں ہوئے اور اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ طنز و مزاح کے میدان میں شاعروں کی طرح لاکھوں کا مجمع نہیں ہے۔ بلکہ جو نیا دیوانہ آتا ہے جلد پہچانا جاتا ہے اور اُسے دیکھ کر خوشی بھی ہوتی ہے کہ آخر اس خارزار میں کسی نے تو قدم رکھا۔ حافظ مظفر محسن بھی ہمارے قبیلے کا ایک فرد لگتا ہے۔ وہ ایک جینوئن مزاح نگار ہے۔ ملاقات سے پہلے اخبارات کی ورق گردانی کرتے ہوئے کبھی کبھار مظفر محسن کی کوئی تحریر نظر سے گزر جاتی۔ وہ تحریر نہ تو مکمل طنز و مزاح کے زمرے میں آتی اور نہ ہی سنجیدہ نثر کے زمرے میں بلکہ ان دونوں کے مابین وکھری ٹائپ کی کوئی تحریر ہوتی۔ مظفر محسن سے جب دو چار ملاقاتیں ہوئیں تو اندازہ ہوا کہ وہ صرف شگفتہ نثر ہی نہیں لکھتا بلکہ طنزیہ جملوں کے تیر برساتا، شرارتیں اور چھیڑ خانیاں بھی کرتا ہے۔ حافظ مظفر محسن کی تحریر میں اُس کی شخصیت کے یہ پہلو جھلکتے ہیں۔ لہٰذا اُس کی تحریر پڑھ کر اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ وہ روزمرہ کے واقعات کو موضوع سخن بناتا اور ہمارے اردگرد پھیلے کرداروں کو کٹہرے میں لاکھڑا کرتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ان سے چھیڑ خانیاں اور مستیاں کر کے پھر اُن سب کو باعزت بری بھی کر دیتا ہے۔ حافظ مظفر محسن کو مزاح لکھنے کا حق اس لیے بھی حاصل ہے کہ اس کے چہرے پر ایک دلکش مسکراہٹ ہر وقت پھیلی رہتی ہے جو کہ فی زمانہ کسی صدقہ جاریہ سے کم نہیں۔ مجھے یہ شخص پسند ہے کیونکہ وہ ایک سچا اور مخلص انسان ہی نہیں بلکہ ایک شگفتہ اور جینوئن مزاح نگار بھی ہے۔

عطاء الحق قاسمی

اپنی کتاب کی بہترین اشاعت کے لیے رابطہ کریں

نستعلیق Publications
غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 042-3751963
nastalique786@gmail.com

برطانیہ (ٹونگھم) میں مقیم معروف شاعرہ، ناول نگار اور افسانہ نویس

سعدیہ سیٹھی

کی کتابیں

- کبھی ناراض مت ہونا (شعری مجموعہ)
- تنہائیاں (شعری مجموعہ)
- محبت آخری سچ ہے (ناول)
- پہیلیاں (بچوں کے لیے)

شائع ہو گئی ہیں

نستعلیق Publications
غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 042-3751963
nastalique786@gmail.com

ہر طرف گہرا دھواں ہے اور میں
اک نیا پھر امتحاں ہے اور میں

چاند ہیں حدِ نظر تک آنکھ کے
آنسوؤں کی کہکشاں ہے اور میں

رسم دُنیا کے تقاضے اور ہیں
کیا کروں کہ دل جواں ہے اور میں

لاکھ اندیشے کروڑوں وسوسے
جانے کیا سے کیا گماں ہے اور میں

آنچل اوڑھے چل رہی ہوں اس کے ساتھ
سر پہ بوڑھا آسماں ہے اور میں

موت ہی لگتی ہے اُمید بہار
زندگی بھر کی خزاں ہے اور میں

سامنا ہے پھر نئی اِک جنگ کا
سعدیہ پھر خانداں ہے اور میں

معروف شاعرہ

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ

کے شعری مجموعے

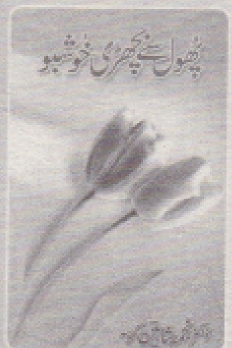

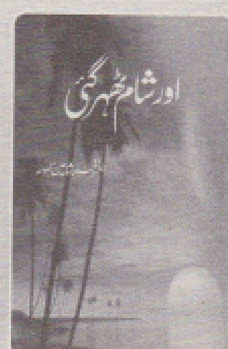

کہیں پہ گرد کہیں پر ہوا بناتی ہوں
میں خود کو اب تو بس اپنے سوا بناتی ہوں

بکھر گئے تھے کسی نام کے حروف کہیں
اب ان کو جوڑ کے اک آئینہ بناتی ہوں

اجالتا ہے یہ تاریکیاں میرے دل میں
تمھاری یاد کو ہر پل دیا بناتی ہوں

جب اپنے اشک چھپاتی ہوں مسکراہٹ سے
تو اپنے درد کو اپنی دوا بناتی ہوں

تراش کر کسی پتھر کے ایک پیکر کو
کمالِ عشق سے اُس کو خدا بناتی ہوں

کہ خواب میں رہے تا دیر گفتگو تجھ سے
ذرا سی بات کو میں واقعہ بناتی ہوں

سنا تھا میں نے جو شاہین ایک لمحے کو
اس ایک لمحے کو اپنی صدا بناتی ہوں

رابطہ الحمد پبلی کیشنز۔ انارکلی لاہور • نستعلیق مطبوعات۔ غزنی اسٹریٹ اردو بازار لاہور

نامور شاعر، افسانہ نگار، کالم نویس اور انشائیہ نگار

محمد ممتاز راشد لاہوری کی نئی کُتب

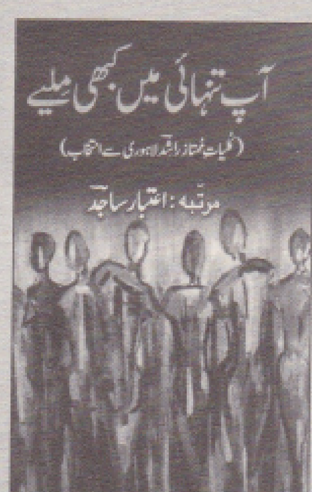

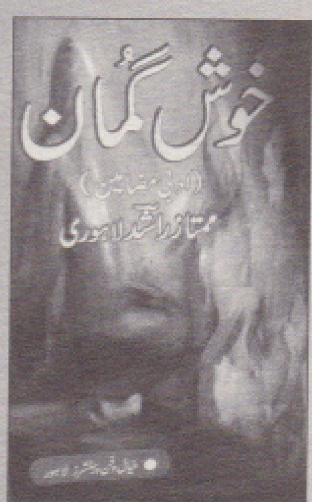

ملنے کا پتہ: ''ماورا'' شاہراہ قائداعظم لاہور

راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 17 واں سال

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

ماہنامہ ارژنگ لاہور

Monthly Arxang Lahore

پاکستان اور دنیا بھر کے اہلِ ادب کا ترجمان میگزین

اعلیٰ ادبی و صحافتی روایت کا امین

مدیر اعلیٰ ❀ عامر بن علی ❀ مدیر ❀ حسن عباسی

ادبی سلسلے

- حمد و نعت
- شاعری
- افسانے
- تبصرۂ کتب
- سفرنامے
- انشائیے
- تنقید و تحقیق
- شعری گوشے
- آپ بیتی
- تراجم
- نامہ ہائے احباب
- عالمی شاعری
- طنز و مزاح
- نامور ادبی شخصیات کے دلچسپ انٹرویوز
- مختصر ادبی خبریں

ماہنامہ ارژنگ کے سالانہ ممبر بن کر ادب کے فروغ میں ہمارا ساتھ دیں

سالانہ ممبر شپ مع ڈاک خرچ مبلغ ایک 1000 روپے بیرونِ ملک 5000 روپے

ماہنامہ ارژنگ میں اشتہارات کی بکنگ کے نرخ

تفصیل	برائے ایک شمارہ	برائے تین شمارے	برائے چھ شمارے
مکمل صفحہ رنگین	5000 روپے	15000 روپے	30000 روپے
آدھا صفحہ رنگین	3000 روپے	9000 روپے	18000 روپے
مکمل صفحہ بلیک اینڈ وائٹ	3000 روپے	9000 روپے	18000 روپے
آدھا صفحہ بلیک اینڈ وائٹ	2000 روپے	6000 روپے	12000 روپے

ماہنامہ ارژنگ کی سالانہ ممبر شپ اور اشتہار کے لیے ابھی رابطہ کریں

0300-4489310-0331-4489310 nastalique786@gmail.com

دفتر: F/3 فیروز سنٹر غزنی اسٹریٹ اردو بازار لاہور، 54000 پاکستان

ممتاز شاعرہ اور کالم نویس

ڈاکٹر صغریٰ صدف

کے شعری مجموعے

وعدہ

کا تیسرا ایڈیشن شائع ہو گیا ہے

نستعلیق
Publications
غزنی سٹریٹ۔ اردو بازار۔ لاہور
0300-4489310 - 042-3751963
nastalique786@gmail.com

عمان (مسقط) میں مقیم نوجوان شاعر

قمر ریاض

کے پہلے شعری مجموعے جیون، تتلی اور میں کا دوسرا ایڈیشن
اشاعت کے مراحل میں

عشق میری حیات ہو جیسے
یہی کل کائنات ہو جیسے
وہ سمجھتا ہے بھول جانا مجھے
عام سی کوئی بات ہو جیسے
ایسا لگتا ہے زندگی کا سفر
کوئی لمبی سی رات ہو جیسے
دل کے یوں ٹوٹنے سے لگتا ہے
ہو گئی میری مات ہو جیسے
میں کہاں اور وہ کہاں ہے قمرؔ
پھر بھی لگتا ہے ساتھ ہو جیسے

نستعلیق
Publications
غزنی سٹریٹ۔ اردو بازار۔ لاہور
0300-4489310 - 042-3751963
nastalique786@gmail.com

نعت شروع زندگی سے ہی میری روح میں سمائی ہوئی ہے

جو لطف و سرور درویش کے قدموں میں بیٹھ کر ملا وہ کہیں اور حاصل نہ ہو سکا

معروف شاعر اور پی ٹی وی پروڈیوسر علی رضا سے حسن عباسی کی گفتگو

جینوئن تخلیق کار اپنی موت کے بعد بھی زندہ رہتا ہے

ارژنگ: شاعری کا آغاز کب اور کیسے ہوا؟

علی رضا: کوئی بھی صلاحیت انسان میں پیدائشی ہوتی ہے۔ لیکن اس صلاحیت کے اظہار کا وقت مقرر ہوتا ہے۔ مجھ میں بھی شعری تخلیق کی صلاحیت موجود تھی اور اس کے باقاعدہ اظہار کا موقعہ مجھے 85-1984 کے لگ بھگ ملا۔ ساہیوال اور مضافات میں ہونے والی علمی اور ادبی تقریبات میں شرکت نے میرے اس ذوق کو جلا بخشی اور میں نے سب سے پہلے اُردو نعت لکھ کر اپنے شعری تخلیقی سفر کا آغاز کیا اور اللہ کے کرم سے ابتدائی دور ہی میں میری تخلیقات ”فنون“، ”اوراق“، ”تخلیق“، ”ادب لطیف“، ”نیرنگ خیال“، ”ادبیات“، ”محفل“، ”ماہِ نو“، ”شام و سحر“، ”تجدید نو“ جیسے مؤقر اور مستند ادبی رسائل میں شائع ہوتی رہیں۔

ارژنگ: آپ دبستانِ ساہی وال کے اہم شاعر ہیں اور وہاں کے شعرا کے ساتھ آپ کی قربت رہی ہے۔ کچھ یادیں تازہ کریں۔

علی رضا: ساہی وال نے بہت سی قد آور علمی اور ادبی شخصیات کو شناخت دی ہے جن میں مجید امجد، منیر نیازی، اسرار زیدی، ڈاکٹر الف دنسیم، ڈاکٹر خورشید رضوی، ڈاکٹر سہیل احمد خان، فرخندہ لودھی، طارق عزیز، ڈاکٹر سعادت سعید، سعید آسی، ڈاکٹر مہدی حسن اور دوسرے بہت سے افراد شامل ہیں۔ مجھے جو دور نصیب ہوا اس وقت ساہیوال میں جن اہل قلم کی صحبتوں اور نشستوں میں بیٹھنے کی سعادت حاصل ہوئی اور ان سے کسب فیض کرنے کے مواقع میسر آئے ان میں محمد اکرم خان قمر، ڈاکٹر الف دنسیم، جعفر شیرازی، حاجی بشیر احمد بشیر، گوہر ہوشیارپوری، سیّد ناصر شہزاد، راؤ محمود علی محمود، نصیر احمر، سیّد شوکت ہاشمی، ڈاکٹر کاظم بخاری، ذکا اللہ انجم ملغانی، ریاض نغمی، ڈاکٹر جاوید باآتش، ایزد عزیز، آفتاب کاوش، سیّد ریاض حسین زیدی، محمد اکرم ناصر،

صدرِ پاکستان ممنون حسین سے اپنے نعتیہ مجموعے ”ثنائے سرورﷺ“ پر قومی سیرت ایوارڈ لیتے ہوئے

ارجمند قریشی، طالب جتوئی، عبدالرحمان انجم، قسور بٹ، واصف سجاد، غضنفر عباس سیّد، ضیغم رضوی، مرتضیٰ ساجد اور ان کے بعد میں آنے والوں میں اوصاف شیخ، افتخار شفیع، افتخار شوکت، حسرت بلال، اسلم سحاب ہاشمی اور دیگر کے نام آتے ہیں۔ میری ان سب سے زبردست ملاقاتیں رہیں اور میں نے ان سب سے بھرپور محبتیں سمیٹیں۔ اس دور کو یاد کرتا ہوں تو میرے چاروں طرف خوشبوئیں پھیل جاتی ہیں۔ غزل کی تخلیق کے حوالے سے جو بھرپور کام ساہیوال میں ہوا ہے اس کی بنیاد پر اس کو ”شہرِ غزل“ کا نام دیا گیا اور یہ ادبی دنیا میں اسی حوالے سے مشہور ہوا۔

ارژنگ: آپ کا نظریہ شعر کیا ہے؟

علی رضا: میں شعر برائے شعر کا ہرگز قائل نہیں ہوں۔ میرا خیال ہے جس شعر میں کوئی پیغام نہیں وہ بے فائدہ ہے۔ شعر کے اندر کوئی سبق یا پیغام ضرور ہونا چاہیے۔

ارژنگ: آپ مشاعروں کی روایت کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ کیا یہ قاری کے ادبی ذوق اور نئے شعرا کی تربیت کے لیے ضروری ہیں؟

علی رضا: ماضی ہی سے مشاعروں کی روایت بڑی مضبوطی اور تواتر سے چلی آ رہی ہے جس نے اہل ذوق کی ادبی تسکین کا سامان بھی پیدا کیا ہے۔ مشاعروں کی اس روایت نے نئے لکھنے والوں کی بھی تخلیقی تربیت کی ہے اور انھیں اس حوالے سے عصری شعور اور عہد موجود کے فنی تقاضوں سے آگاہی بھی دی ہے۔ لمحہ فکریہ ہے کہ موجودہ دور میں سنجیدہ مشاعروں کی روایت زوال پذیر ہوتی جا رہی ہے اور مزاحیہ اور غیر سنجیدہ شاعری کو ہاتھوں ہاتھ لیا جانے لگا ہے۔

ارژنگ: ادب میں گروہ بندیوں کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

علی رضا: ادب میں گروہ بندیاں ہمیشہ ہی سے چلی آ رہی ہیں اور اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ جہاں ان گروہوں

بقیہ اندرونی صفحات

مقبول شاعر، منفرد کالم نویس اور مترجم عامر بن علی کی تمام تصانیف کے

''تازہ ایڈیشن'' شائع ہو گئے ہیں

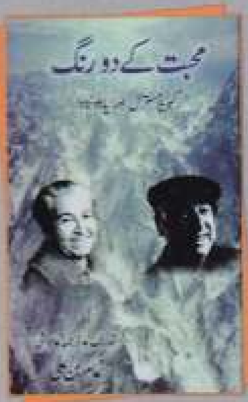

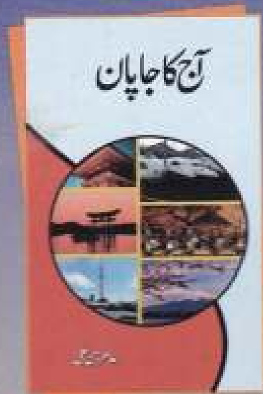

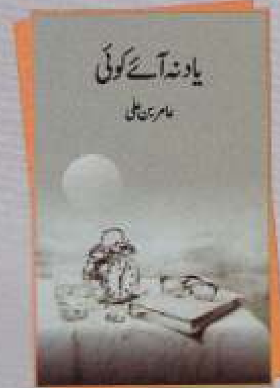

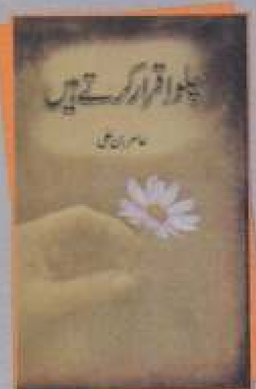

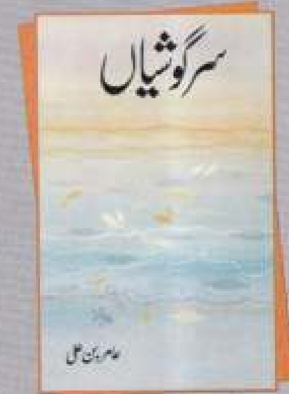

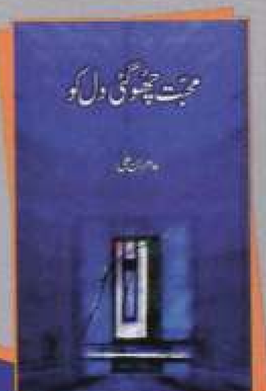

Amir Bin Ali is one of the finest Poets from younger generation that have emerged during last decade.
(Express Tribune Book Review)

Staying away from his homeland makes Amir Bin Ali skeptical that he might get disconnected from his past, it is evident from his poetry and prose that he loves his country a lot and want to stay connected. He is successfully doing so through his writings.
(Daily The Nation Book Review)

تفصیل کتب

- محبت چھو گئی دل کو (شعری مجموعہ)
- چلو اقرار کرتے ہیں (شعری مجموعہ)
- مکتوب جاپان (کالمز)
- سرگوشیاں (شعری مجموعہ)
- آج کا جاپان (سفرنامہ)
- گفتگو (انٹرویز)
- یاد نہ آئے کوئی
- محبت کے دو رنگ - گبریلا مسترال اور پابلو نرودا (ہسپانوی زبان سے براہ راست اُردو میں کیے گئے تراجم)

Design By: 0300-4529621
MUHAMMAD AHSUN Gull

Read Arxang Online
www.amirbinali.com
www.millat.com